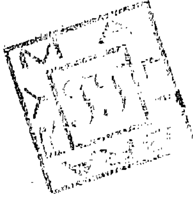
سجّاد حیدر یلدرم



مرتبہ

سیّد مُبارز الدین رفعت

ایم۔اے

ناشر

ادارۂ دانش و حکمت

حیدرآباد دکن

طبع اوّل ۱۰۰۰

۱۹۳۶ء

۵۰۱۴۰۷

سول ایجنٹ :

اسٹار ایجوکیشنل سپلائی کمپنی

عابد روڈ حیدرآباد دکن

قیمت ۱۲؍

سجّاد حیدر یلدرم

حرفِ اوّل

سجاد حیدر یلدرم ہمارے ادبِ لطیف کے اولین
پیش رو تھے۔ ضرورت تھی کہ ان پر کوئی مستقل کتاب
لکھی جاتی۔ جو کچھ ان کے بارے میں لکھا گیا ہے وہ
مختلف مضامین ہیں جو اب سجاد مرحوم کے کمال کے
اعتراف اور ان کی ایک یادگار کی حیثیت سے کتابی
صورت میں شائع کئے جا رہے ہیں۔

پرنسپل مشتاق احمد زاہدی

سید سجاد حیدر یلدرم

ہر فرد بشر کی زندگی کے تحت بہت سے پہلو ہوتے ہیں۔ کوئی رُخ کسی کے سامنے آتا ہے اور کوئی کسی کے۔ سید سجاد حیدر یلدرم بغداد میں پولیٹکل ڈریگومان یعنی سیاسی ترجمان رہے۔ یو۔پی میں ڈپٹی کلکٹر رہے۔ علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار رہے اس سے قبل حاجی اسمٰعیل خاں صاحب رئیس دتاول کے سیکریٹری۔ انگریزی کے استاد اور ترکی زبان کے شاگرد رہے۔ راجہ اعظم شاہ والئی ناگ پور کے اتالیق اور معزول شدہ امیر کابل امیر یعقوب خان کے سیاسی نگران اور مہاراجہ صاحب محمود آباد کے سیکریٹری رہے۔ مگر میرے پیش نظر ان کی مختلف زندگیوں کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ میں نہ ڈپٹی کلکٹر سجاد حیدر کو جانوں نہ میں سجاد حیدر رجسٹرار سے واقف۔ میں تو صرف سجاد حیدر اور یلدرم کو بہ حیثیت مضمون نگار، ناول نویس اور شاعر کے، میں سید صاحب مرحوم کی نہ مدح سرائی کرنا چاہتا ہوں اور نہ مرثیہ خوانی۔ میں صرف ان کی وہ تصویر پیش کرنا چاہتا ہوں جو میرے ذہن میں ہے۔

سید سجاد حیدر صاحب سے میری دوستی کی ابتدا ۱۸۹۶-۹۷ء سے ہوئی۔
جب ہم دونوں مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں ایف۔ اے میں پڑھتے تھے۔
اتفاق کی بات ہے کہ ہمارے ساتھ بہت سے ایسے جماعتی تھے جنھوں نے
اپنے اپنے فن میں بہت نام پایا۔ مثلاً مقصود علی خان یونیورسٹی میں اوّل
پاس ہوئے اور پھر یو۔ پی میں ڈپٹی کلکٹر ہوکر کمشنر کے عہدے تک پہنچے۔
اسی طرح ملک زمان مہدی خان بھی الہ آباد یونیورسٹی میں شاید دوم نمبر میں
پاس ہوئے اور پنجاب میں ڈپٹی کمشنر ہوئے۔ محمد علی جو بعد میں مسٹر محمد علی
ہوکر اور مولانا سے اور اپنی قابلیت اور قوم پرستی میں شہرۂ آفاق
ہوئے وہ بھی ایف۔ اے میں ہمارے ساتھ تھے سجاد حیدر بھی ان میں سے
کسی سے کم نہ تھے۔ فرق یہ تھا کہ مقصود علی خان اور زمان مہدی
اگرچہ ذہین تھے مگر کتابی کیڑے بھی تھے۔ سجاد ادھر ادھر کی کتابوں کا
مطالعہ تو بہت کرتے تھے مگر امتحان والی کتابوں کو محض ضرورتاً
پڑھ لیتے تھے۔ باوجود اس کے جب ایف۔ اے کا نتیجہ آیا تو معلوم
ہوا کہ سجاد صاحب انگریزی اور فارسی میں تمام الہ آباد یونیورسٹی میں
اوّل نمبر مگر کم بخت ریاضی میں صفر۔ محمد علی کا وقت بھی کرکٹ کھیلنے
والوں کی صحبت میں ضائع ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ عبد اللہ کرکٹ کپتان
کے ساتھ رہتے تھے۔ تاہم محمد علی بہت ذہین تھے اور اس لئے
امتحان میں پاس تو ہو گئے مگر نمبروں میں سجاد کا لگا بھی نہ کھا سکے۔
محمد علی کی قابلیت آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخل ہوکر چمکی۔ سجاد کی

خاموش قابلیت اور طبعی انکساری کی وجہ سے کالج والے ان کی دل سے قدر کرتے تھے اور ان کے ریاضی میں فیل ہو جانے سے ہر شخص اس مضمون کو بد دعا دیتا تھا۔ ریاضی نے ان کا بہت قیمتی وقت ضائع کرایا جس کی وجہ سے وہ ساری عمر نہ پنپ سکے اور ملازمت کی دوڑ میں مقصود علی تھاں اور زمان مہدی جیسے ساتھیوں سے پیچھے رہ گئے۔ مگر طالب علمی کے زمانے میں ان باتوں پر کوئی غور نہیں کیا کرتا۔ اور باوجود اس ناکامی کے سجاد کی ہر دلعزیزی اور شہرت میں کوئی کمی نہ آئی بلکہ طلبا، اور پروفیسروں کو سجاد سے ہمدردی اور زیادہ ہوگئی کہ افسوس ایسا قابل شخص ریاضی کی وجہ سے رہ جائے۔ چنانچہ جب بی اے میں ریاضی سے پیچھا چھوٹا تو سجاد نے تمام الہ آباد یونیورسٹی میں چوتھے نمبر پر پاس ہوئے۔

یونین میں تقریر کرنے کا شوق سجاد کو سکول کے زمانے سے تھا۔ اخبار بینی کا بھی مرض تھا۔ اس لئے یونین کے سب اعزازی عہدے ان کو حاصل ہوگئے یعنی وہ سیلکٹ کمیٹی کے ممبر ہوئے پھر لائبریرین ہوئے پھر سیکرٹری مقرر ہوئے اور آخر میں تقریر کرنے کا انعام بھی حاصل کیا جس میں ان کا نام یونین کے ہال میں اس وقت تک لکھا ہوا ہے۔

مضمون نگاری سجاد حیدر نے ایف اے کے زمانے میں یا اس سے بھی قبل شروع کی۔ اسی زمانے میں ان کا تعلق

حاجی اسمٰعیل خان صاحب رئیس دتاولی سے ہوگیا۔ حاجی صاحب موصوف اس زمانے کے نامور اُردو ادیب بھی تھے اور ترکی زبان بھی خوب جانتے تھے۔ ممالک مشرقی کی سیر بھی کر آئے تھے اور انھوں نے ایک اُردو رسالہ بھی جاری کیا تھا جس میں بہت اعلیٰ قسم کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ سجاد صاحب حاجی صاحب کے سیکرٹیری بھی تھے اور ان کو انگریزی بھی پڑھاتے تھے۔ اس زمانے میں سجاد صاحب کی عمر بہت زیادہ نہ تھی۔ چنانچہ حاجی صاحب کی صحبت کا ان پر بہت اثر پڑا، اور اوّل تو یہ کہ ان کو ادب اُردو سے جو ذوق تھا وہ پختہ ہوگیا۔ دوم یہ کہ انھوں نے ترکی سیکھی اور حاجی صاحب کی طرح مشرقی ممالک، خاص کر ترکی کی سیر کے بہت دل دادہ ہو گئے۔ انگریزی انشاپردازی میں بھی سجاد حیدر صاحب بی اے پاس کرنے سے پہلے ہی اپنے ہم عصروں میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ کالج کے طلبا اس زمانے میں اچھی انگریزی ہونے کا معیار یہ سمجھتے تھے کہ "پانیر" میں مضمون چھپ جائے۔ اکثر طلبا نے جن کو اپنی انگریزی پر ناز تھا سعی لاحاصل کی مگر سب سے پہلے سجاد حیدر کا ہی ایک مضمون شائع ہوا۔ اس کے بعد جن صاحب کا مضمون شائع ہوا وہ محمد علی تھے جو ان کے کلاس فیلو تھے۔ اس کے کئی سال بعد سید رضا علی (جو اب آنریبل ہیں) کے بہت سے خطوط جو اچھے طویل ہوتے تھے "پانیر" میں چھپنے لگے تو یار لوگوں نے

یہ کہنا شروع کر دیا کہ اب "پائینیر" کا معیار کم ہو گیا ہے۔

بی اے پاس کرنے کے بعد سجاد حیدر صاحب ناگ پور کے راجہ اعظم شاہ کے اتالیق مقرر ہو کر ناگ پور گئے مگر بعد میں گورنمنٹ نے علی گڑھ کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیج دیا۔ ایک ریلوے کی کوٹھی جو کالج سے دور نہ تھی ان کے رہنے کے لئے کرایہ پر لی گئی اس میں دو کمرے قانون پڑھنے والے طلباء کے لئے مخصوص کئے گئے چنانچہ سجاد کی کوشش سے اس میں مجھے اور مرحوم انعام الحق کو (جو گورنمنٹ آف انڈیا کے پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ میں پہلے انڈر سکریٹری مقرر ہوئے اور خان صاحب اور خان بہادر کے حق دار ہوئے) جگہ ملی۔ اور اب ساری کوٹھی ہم تینوں ہم خیال و ہم مذاق دوستوں کے قبضے میں آ گئی۔ راجہ صاحب تو بے چارے شاگرد تھے علٰحدہ کونے میں پڑے رہتے تھے۔ اس کوٹھی کا نام "بیچلر لاج" یعنی کنوارا گڈھ رکھا گیا۔ کیونکہ نہ صرف یہ کہ ہم تینوں کنوارے تھے بلکہ اس وقت ہمارا یہ خیال بہت زیر بحث رہتا تھا کہ دنیا میں ترقی کرنے اور آرام سے رہنے کے لئے متاہل زندگی موزوں نہیں۔ اس خیال کی حقیقی وجہ یہ تھی کہ ہم لوگوں کو نئی تہذیب بہت چرگئی تھی۔ اور اس زمانے میں یعنی اب سے پچاس برس قبل مسلمان عورتیں انگریزی تعلیم سے تو محض نابلد تھیں۔ اردو لکھنا پڑھنا بھی کسی کسی کو آتا تھا۔ اور جن کو آتا تھا وہ اس زمانے میں بڑی تعلیم یافتہ سمجھی جاتی تھیں۔ اور مغربی طرز زندگی سے تو سارے ہندوستان میں سوائے

معدودے چند خواتین کے کسی کو بھی واسطہ نہ تھا۔ اور ہم لوگ چاہتے تھے کہ جس طرح ہم بیچلرز لاج میں صاحبانہ زندگی بسر کرتے ہیں اس کی ہماری رفیقۂ حیات بھی اہل ہو۔ اور چونکہ یہ بات ناممکن معلوم ہوتی تھی اس لئے یہ خیال دل نشین ہوگیا تھا کہ جب تک اس قسم کی بیوی نہ ملے شادی کرنی ہی نہ چاہیئے۔ کنوار گڈھ کے نام سے یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ اس کے مکین عورت سے نفرت کرتے ہیں۔ مگر اس کے برعکس ہم لوگ عورت کی بہت عزت کرتے تھے اور انعام مرحوم تو خاص تو قیر کرتے تھے اور ہم نے اس وقت سے اپنا مقصدِ زندگی مسلمان ہندی عورت کو تعلیم کے ذریعہ بتدریج معراجِ ترقی تک پہنچانا قائم کیا تھا۔ چنانچہ اسی زمانے میں ایک اور حامیٔ نسواں شیخ عبداللہ صاحب نے اسی مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے علی گڈھ سے ایک زنانہ رسالہ "خاتون" شائع کیا جس کے شاید پہلے ہی نمبر میں ہمارے کنوار گڈھ کے ممبر انعام الحق صاحب نے حقوقِ نسواں پر ایسا زبردست مضمون لکھا کہ جس کی دھوم ہوگئی اور ہم تینوں ہمیشہ اس رسالے میں مضمون دیتے رہے۔ اسی سلسلہ میں اسی زمانے میں (۱۹۰۴ء۔۵ء) علی گڈھ کالج میں پہلی زنانہ کانفرنس منعقد ہوئی جس کے بانی جناب شیخ عبداللہ صاحب تھے۔ لیکن ہم تینوں نے بھی اس کو کامیاب بنانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ یہ کانفرنس ہمارے لئے کئی معنوں میں دلچسپ اور نرالی تھی۔ اوّل یہ کہ ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہندوستان میں محترمہ عطیہ فیضی جیسی انگریزی داں، آزاد خیال اور ترقی یافتہ مسلمان خواتین بھی موجود ہیں جو سر سید احمد خان کے کالج کی

سر پہ فلک چار دیواری میں بھی پردہ کرنے کو قید محض سمجھتی ہیں۔ اور آبرو بیگم جیسی مشرقی علم و فضل میں یگانۂ روزگار مستورات بھی ہیں جن تک علم کی روشنی سات پردوں میں بھی پہنچ گئی۔ دوم یہ کہ ایسی خواتین کی موجودگی میں حامیانِ طبقۂ نسواں کو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

بیچلرز لاج کی زندگی کبھی نہ بھولے گی، ڈگری لینے کی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے، قانونی تعلیم محض علی گڑھ کالج سے وابستہ رہنے کا بہانہ تھا۔ سوائے نئی دنیا بنانے کے اور کسی قسم کا فکر نہ تھا۔ کالج کے نئے اور پرانے سربرآوردہ طلباء کو ہر ہفتے دعوت پر یا چائے پر مدعو کیا جاتا تھا اور اتفاق سے اگر کوئی قوم کی مقتدر ہستی کالج کے ملاحظے کے لئے علی گڑھ میں موجود ہوتی تو ان کے فیضانِ صحبت سے بھی استفادہ حاصل کیا جاتا تھا۔ اور یہ مواقع اس لئے نکالے جاتے تھے کہ باہمی تبادلۂ خیالات کے بعد قومی اور معاشرتی مسائل کے حل کرنے کی کوئی صورت نکالی جائے تاکہ اس نئی دنیا کو قائم کر سکیں جس کے ہم خواب دیکھا کرتے تھے۔ بحث کے موضوع زیادہ تر حقوقِ نسوان، تعلیمِ نسوان، پردہ، نئی روشنی، مغربی طرزِ معاشرت، احکام اور شریعتِ اسلام ہوا کرتے تھے۔ سجاد ان مباحثوں میں پیش پیش ہوتے تھے۔ جو تجاویز وہ پیش کرتے وہ اس وقت ناقابلِ عمل معلوم ہوتی تھیں۔ مثلاً ان کا ایک یہ خیال تھا کہ نماز دیسی زبان میں ہوا کرے اور قرآن شریف کا ترجمہ بغیر عربی عبارت کے علاوہ کتاب کی صورت میں شائع کیا جاوے۔

مسجدوں میں وضو کرنے کے لئے ایسے غسل خانے بنائے جائیں جن میں کوٹ، پتلون اور ہیٹ استعمال کرنے والے مسلمانوں کو وضو کرنے میں سہولت ہو۔ جہاں ہیٹ لٹکانے کا انتظام ہو۔ اور اگر جوتے سمیت نماز پڑھی جاوے تو جوتے یعنی بوٹ پر چڑھانے کے لئے مسیّوں کے قسم کے غلاف ہوں۔ اسلامی قانون اور وراثت میں بھی وہ مشترکہ خاندان کی طرز پر تبدیلی چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں وراثت کی اسلامی تقسیم کی موجودگی میں مسلمان دولت کو ایک خاندان میں عرصہ تک نہیں رکھ سکتے۔ اس قسم کے دوستانہ مناظروں کے مبحث اکثر مضامین کی شکل میں رسالوں میں ظاہر ہوتے تھے۔ اُردو کے قرآن شریف اور اُردو میں نماز پڑھنے اور تقسیم وراثت پر جو سجاد حیدر صاحب کے مضامین اس زمانے کے رسالوں میں شائع ہوئے تو ان کے خلاف بہت کچھ لے دے ہوئی۔ اسی زمانے میں بغداد میں ایک ترجمان کی جگہ نکلی اور پرنسپل علی گڑھ کالج سے اس کی مانگ آئی۔ بہت سے طالب علموں نے درخواستیں دیں جن میں بعض ایسے بھی تھے جن کا کام روزانہ پرنسپل صاحب کو سلام کرنا بھی تھا اور جو عربی میں ایم اے تھے۔ سجاد صاحب نے بھی درخواست دی گو سجاد صاحب بی اے تھے اور پرنسپل موریسن سے کبھی ملتے بھی نہ تھے مگر موریسن صاحب نے سب سے زیادہ سجاد کی سفارش کی۔ نیز ان کو ترکی بھی آتی تھی چنانچہ ہم لوگوں کے خیال میں غیر متوقع طور پر ان کا تقرر ہو گیا اور ان کے جانے سے بیچلرز لاج کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

سجاد بغداد میں کئی سال تک اپنے فرائضِ منصبی نہایت شرافت اور
خوش اسلوبی سے ادا کرتے رہے۔ شرافت میں نے اس لئے لکھا کہ سیاسی کاموں میں
بہت کچھ لگائی بجھائی کرنی پڑتی ہے اور اپنے ہم قوم اور ہم مذہب لوگوں کے
گلے کاٹنے پڑتے ہیں۔ مگر یہ کام سجاد نے نہیں کیا۔ اور اس کا سب سے
بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کو اس اہم سیاسی عہدے کے باوجود کوئی خطاب
نہیں ملا۔ اور نہ یہ عہدہ ان کی ترقی کا زینہ بن سکا۔ بغداد سے آخر ان کا
دل بھر گیا اور وہ چھٹی لے کر ہندوستان آئے۔ واپسی پر ہم نے دیکھا کہ
بغداد کی آب و ہوا سجاد کو بہت موافق آئی تھی اور وہ بہت فربہ اور
توانا معلوم ہوتے تھے۔ سیاسی حالات کے متعلق تو وہ بہت ہی محتاط تھے،
اور کبھی کسی بات کا ذکر تک نہ آیا۔ لیکن بغداد کے اور حالات جو انھوں نے
سنائے تو ان سے یہ سن کر تعجب ہوا کہ وہاں خاکروب یا بھنگی نہیں ہوتے۔
پاخانوں کی بجائے گھروں میں بڑے گہرے گڑھے کر لئے جاتے ہیں
جن میں نجاست مہینوں تک جمع ہوتی رہتی ہے۔ اور جب وہ گڑھے
بھر جاتے ہیں تو میونسپلٹی کے آدمی جو مسلمان ہوتے ہیں آکر صاف
کر جاتے ہیں یعنی کدال پھاوڑوں سے کھاد نکال کر لے جاتے ہیں۔
لیکن انگریز لوگ پاٹ استعمال کرتے ہیں جن کی صفائی عیسائی لوگ
کرتے ہیں۔ چنانچہ سجاد نے بھی ایک عیسائی دس روپے ماہوار پر
خاکروب کے فرائض ادا کرنے کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔ بغداد میں تمام
اسلامی احکام شرعی کا بھی بہت احترام کیا جاتا تھا چنانچہ رمضان شریف کے

ماہ مبارک میں تمام طباخیوں کی دکانیں اور کھانے کے ہوٹل حکماً بند کر دیے جاتے ہیں اور کوئی شخص بازار میں سگریٹ نہ پی سکتا تھا۔ حتیٰ کہ غیر مسلم مثلِ یہود و نصارا بھی ان اسلامی احکام کا سخت احترام کرتے تھے اور خواہ وہ ترکوں کی حکومت کے کتنے ہی خلاف ہوں مگر منہ سے ہمیشہ ترکوں کی تعریف ہی کرتے رہتے تھے۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب ترکوں نے خلافت اپنے ہاتھ میں رکھ چھوڑی تھی جس کی وجہ سے تمام غیر مسلم قوموں پر اسلام اور ترکوں کا بہت رعب تھا اور اب چونکہ ترکوں نے نہ صرف خلافت بلکہ سلطنت کے لئے اسلام سے بھی ہاتھ اُٹھا لیا تو وہ رعب ختم ہوگیا، بلکہ اُلٹا غیر مسلم اقوام سے اہلِ عراق مرعوب ہوگئے ہیں۔

چھٹی پر ہندوستان آنے کے بعد سجاد واپس بغداد نہ گئے اور پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ نے ان کو معزول شدہ امیرِ کابل امیر یعقوب خان پر جو مسوری میں رہتے تھے بہ حیثیت پولیٹکل افسر تعینات کر دیا۔ اس عرصہ میں سجاد قسطنطنیہ کی بھی سیر کر آئے تھے اور وہاں سے ایک ترکی برقعہ بھی ساتھ لائے تھے جو انھوں نے امانتاً میرے پاس رکھوا دیا تھا۔ ایک دن مسوری سے تار آیا کہ برقعہ فوراً پارسل کر دو۔ تھوڑے دن بعد معلوم ہوا کہ سجاد حیدر صاحب کی شادی ہوگئی۔ اس موقعہ پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کنوارگڈھ کے باشی جہاں پردے کے

خلاف دھواں دھار تقریریں ہوتی تھیں اور آزاد عورت کی نئی دنیا قائم کرنے کے خواب دیکھے جاتے تھے کیوں شادی کرتے ہی ایسے پردے کے حامی ہو گئے کہ برقعہ کی ضرورت ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اب سے پچاس برس پہلے کا زمانہ اور تھا۔ اس وقت عورتوں کی آزادی اور مغربی معاشرت کے متعلق ہمارے خیال کی پرواز ترکوں ہی تک ہو سکتی تھی۔ اور مغربی زندگی کا جو معیار سر سید احمد خان نے اپنے پیش نظر رکھا تھا کہ ترکوں کی معاشرت کو اختیار کیا جاوے وہی معیار ہم لوگوں کے پیش نظر تھا۔ اور ترکی میں عورتیں اس زمانہ میں اس طرح بے حجابانہ یورپین تمانہ ہوئی تھیں جیسے آج کل ہیں بلکہ وہ ایک خاص قسم کا برقعہ پہنتی تھیں جس میں چہرہ کھلا بھی رہتا تھا اور بہ وقت ضرورت اس پر نقاب بھی ڈال لی جاتی تھی۔ مگر وہ ہندی مسلمان مستورات کی طرح مقید نہ تھیں۔ چنانچہ سجاد حیدر صاحب نے جن کو ترکی کی ہر ایک چیز سے عشق تھا ترکوں کی پیروی شروع کر دی اور مرتے دم تک اس میں فرق نہ آنے دیا۔ چنانچہ جب ترکوں نے برقعہ بھی ترک کر دیا تو سجاد صاحب بھی ان سے پیچھے نہ رہے۔ ان کی خوش قسمتی سے ان کو جو رفیقۂ حیات ملیں وہ بھی نہ صرف اس نئی طرز زندگی کی اہل تھیں بلکہ ان کو اس کا عشق ہے۔ چنانچہ ان کے ناول اسی زندگی کے نقشے پیش کرتے ہیں۔

امیر یعقوب خان کے انتقال کے بعد سید سجاد حیدر صاحب پولیٹیکل سروس سے فارغ ہو گئے۔ حقیقت میں وہ ایسے نیک بندے تھے کہ

وہ اس سروس کے قابل ہی نہ تھے۔ وہ ایسی ملازمت کے اہل تھے جس میں
لکھنے پڑھنے کا کام تھا چنانچہ وہ اس وقت راجہ صاحب محمود آباد کے
جن کو بعد میں مہاراجہ کا خطاب مل گیا تھا سکریٹری مقرر ہوگئے۔ اس کام
کے لئے وہ خاص طور پر موزون تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مہاراجہ صاحب
مسلم لیگ کی سیاسیات میں خاص حصہ لے رہے تھے اور جب ٹرکی
جرمنوں کے مل کر لڑنے کی وجہ سے مسلمانان ہند برطانیہ سے بہت
برافروختہ تھے۔ اور مسلم لیگ کانگریس مسٹر جناح کے زیر اثر کانگریس سے
ہندستان میں خود اختیاری سلطنت قائم کرنے کے سلسلے میں سمجھوتہ
کر چکی تھی اور دونوں کی متفقہ تجاویز برطانوی حکومت کے پاس بھیجی
جا چکی تھیں۔ یہ ہندو مسلم اتحاد کا زمانہ تھا چنانچہ مسلم لیگ کا جلسہ
کانگریس کے جلسے کے ساتھ ہوتا تھا اور مجھے یاد ہے کہ کلکتے کے
جلسے میں جب کہ شاید محمد علی اور شوکت علی جیل خانے میں تھے،
مہاتما گاندھی نہ صرف شریک ہوئے تھے بلکہ انھوں نے پہلی دفعہ
اردو میں تقریر کی تھی۔ اور اس بات پر زور دیا تھا کہ تمام قومی
مجالس میں تقریریں انگریزی کی بجائے اردو میں ہوا کریں۔ مسلم لیگ
اور کانگریس کا یہ اتحاد حکام وقت کی مصلحت کے خلاف تھا چنانچہ
جب بٹلر صاحب یو۔پی کے گورنر ہوئے تو وہ چونکہ راجہ صاحب
محمود آباد کے بہت عزیز اور بے تکلف دوست تھے انھوں نے
راجہ صاحب پر زور رڈال کر ان کو سیاست سے علحدہ کرا دیا اور

یو۔پی گورنمنٹ کا ہوم ممبر کرا دیا، اور مہاراجہ کا خطاب [illegible] دلوا دیا۔
اس سے سجاد حیدر صاحب کو یہ فائدہ ہوا کہ وہ ڈپٹی کلکٹر مقرر
ہو گئے اور جب راجہ صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو
سجاد صاحب کی ملازمت یونیورسٹی میں منتقل ہو گئی اور وہ رجسٹرار
مقرر ہو گئے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کے خلاف جب رحمت اللہ کمیٹی نے
رپورٹ لکھی اور یونیورسٹی کے انتظام میں تبدیلی ہوئی تو سجاد صاحب
واپس اپنے عہدۂ ڈپٹی کلکٹری پر چلے گئے۔ اور جب پنشن ہوئی تو
انھوں نے دہرہ دون میں مستقل قیام شروع کر دیا، جہاں ایک دفعہ
موجودہ راجہ صاحب محمودآباد تشریف لائے اور سجاد صاحب کو
اپنا سکریٹری مقرر کر کے اپنے ساتھ [illegible] لے گئے اور اسی ملازمت میں
سجاد صاحب کے زندگی کے آخری لمحے تک گزر رہے۔

بغداد پہنچنے کے بعد سجاد حیدر صاحب نے اپنا قلمی نام یلدرم
رکھ لیا تھا یعنی جو مضمون بوجہ ملازمت وہ اپنے نام سے نہیں چھپوانا
چاہتے تھے وہ یلدرم کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ یلدرم ایک ترکی لفظ ہے
جس کے معنی "برق" کے ہیں۔ اس لفظ کے تلفظ کی آواز پر غور کرنے سے
خیال ہوتا ہے کہ یلدرم کے معنی گرج یا بادل کے گڑگڑانے کے ہونگے نہ کہ
محض برق کی چمک کے۔ یہ خیال مجھے اس وقت آیا۔ اس لئے سجاد صاحب سے
میں نے اس کی تصدیق نہ کی۔ اگر اس لفظ کے معنی گرج کے لئے جائیں تو
"یلدرم" سجاد کے نام کے ساتھ ہرگز موزون نہ تھا۔ کیونکہ وہ خیالات کی

بارش ضرور کرتے رہے مگر کبھی گرجے نہیں۔ اور جہاں تک مجھے علم ہے یلدرم انھوں نے اپنے اشعار یا نظموں میں بہ طور تخلص کے کبھی استعمال نہیں کیا۔

سید سجاد حیدر صاحب ایک مشہور انشا پرداز، جدت پسند شاعر اور دل کش قصہ نویس تھے۔ ترکی ناولوں کا ترجمہ انھوں نے اس طرح کیا تھا کہ ان ناولوں کو بالکل اپنا لیا تھا۔ اور اس طرح وہ ناول نویس کہلانے کے بھی حقدار ہو سکتے ہیں۔ گو ان کی محترم رفیقۂ حیات بیگم نذر سجاد حیدر صاحبہ حقیقی معنوں میں ناول نویس ہیں اور اس معاملے میں اپنے قابل خاوند سے بازی لے گئی ہیں۔ سید صاحب اگرچہ اس معنی میں شاعر نہ تھے کہ وہ نہ صاحب دیوان تھے اور نہ پبلک مشاعروں میں کرائے پر مدعو کئے جاتے تھے لیکن اگر شاعر کے معنی میں وہ شخص ہے جو شعر کہتا ہو تو سجاد صاحب ضرور شاعر تھے۔ بہ حیثیت انشا پرداز کے انھوں نے ایک خاص طرز تحریر کی بنیاد ڈالی تھی جس سے اردو زبان میں نئے الفاظ انھوں نے ترکی زبان سے لئے۔ ترکوں نے بہت سے محاوروں، اصطلاحوں اور الفاظ کو جو یورپین زبانوں مثل فرانسیسی یا انگریزی میں مستعمل ہیں اپنی زبان میں عربی یا فارسی کی مدد سے لیا تھا۔ سجاد صاحب نے ان کو اردو سے روشناس کرا دیا۔ ان کی یہ نئی طرز تحریر اس زمانے میں بہت مقبول ہوئی کیونکہ اس وقت تک زبان میں عربی فارسی کے لفظ کاٹ کر اس کی قوت اور جاذبیت کو کم کرنے کا خبط اہل قلم کو نہیں ہوا تھا۔ بہت سے اہل قلم نے اس طرز کا تتبع کیا جس میں سلطان حیدر جوش

خاص کر قابل ذکر ہیں۔ سید صاحب موصوف کے مضامین ہمیشہ اپنے رنگ میں نئے اور خیال میں اچھوتے ہوتے تھے اور یہ ان کی ایسی خصوصیت ہے جو بعض ان سے زیادہ مشہور مضمون نگاروں میں کم پائی جاتی ہے۔ وہ غیر زبان کے الفاظ محض خانہ پُری یا رنگینیٔ عبارت کے خیال سے استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ صرف اس وقت استعمال کرتے تھے جب وہ خیال کو دوسرے الفاظ کے ذریعہ ادا نہ کر سکتے تھے۔ سجاد صاحب عام طور پر سنجیدگی اور متانت کے بادلوں میں چھپے رہتے تھے لیکن ان کے بلدرم والے مضامین ایک بجلی کی چمک کی طرح کبھی کبھی ان کے جوانی کے ان جذبات کو تھوڑی دیر کے لئے روشنی میں لے آتے تھے جو ان کی طبیعت کے منافی تھے۔ چنانچہ جب ان کا مضمون "وہ آنکھیں" شائع ہوا تو حلقۂ احباب میں بہت چہ میگوئیاں ہوئیں اور قاری سرفراز حسین صاحب مرحوم مصنف "شاہد رعنا" وغیرہم نے "تو نے مجھے دیکھا کیوں" کے عنوان سے جوابی مضمون شائع کر دیا۔ اور کچھ دنوں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ان کے مضامین کا مجموعہ پہلے "خیالستان" کے نام سے شائع ہوا جو ایک زمانے میں پنجاب یونیورسٹی میں ایف اے کا کورس بھی تھا۔ دوسرا مجموعہ بعد میں "حکایات واحساسات" کے نام سے چھپا۔ انھوں نے ہم ہندوستانیوں کو ترکوں کی معاشرتی زندگی سے پہلی دفعہ ترکی ناولوں اور ڈراموں کو اردو میں ترجمہ کر کے ہم سے آشنا کرایا۔ ان سے قبل محمد حسین صاحب رام پوری نے دو ترکی ناول ترجمہ کئے تھے۔ مگر وہ انھوں نے

انگریزی کی معرفت لیئے تھے۔ براہ راست ترکی سے ترجمہ نہیں کیئے گئے تھے۔
سجاد صاحب نے یوں طالب علمی کے زمانے میں "ثالث بالخیر" "زہرا"
اور "سطلوب بسپینا" ان تین چھوٹے چھوٹے ترکی ناول ترکی سے ترجمہ
کیئے تھے لیکن اس وقت تک ترکی سے ترجمہ کرنے کی زیادہ مہارت
نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ کئی دفعہ قسطنطنیہ گئے اور انھوں نے
اپنا مطالعہ جاری رکھا حتیٰ کہ پھر کئی بڑے بڑے افسانے، ڈرامے،
اور ناول ترکی زبان سے ترجمہ کیئے۔ پہلے "ہما خانم" "پیرانا خواب"
"سیب الفت" ترجمہ کیئے اور بعد میں "جنگ وجدل" اور
"جلال الدین خوارزم شاہ" چھپوائے۔ اور حال ہی میں انتقال سے
قبل "طارق" اور "ابن موسیٰ" دو ترکی ڈرامے ترجمہ کر ڈالے جو ابھی
شائع نہیں ہوئے ہیں۔ ان کی تمام تصنیف پر تبصرہ کرنا اس وقت میرا
مقصد نہیں ہے بس ان کی ایک خصوصیت کا ضرور ذکر کروں گا۔ اور
وہ یہ ہے کہ ان کے ڈراموں یا افسانوں میں آپ کو مصنف کی ذاتی
زندگی کا ذرا سا حال بھی معلوم نہ ہو سکے گا۔ ان کی قوت تخیل ایسی
قوی تھی اور جدت طبع کا یہ زور تھا کہ ان کو اپنے ذاتی ماحول کو کام میں
لانے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ اور اگر وہ کام میں لاتے بھی ہوں گے تو
اس خوبی سے کہ جو تصویریں وہ ہمارے سامنے پیش کرتے تھے وہ
ان کے تصور کا نتیجہ معلوم ہوتی تھیں۔ انھوں نے ہمیشہ اپنی زندگی کو
اپنی پبلک یا سرکاری زندگی سے بالکل علیحدہ رکھا۔ وہ کچہری اور

دفتر میں عہدے دار اور مضامین و افسانوں میں وہ ہمیشہ سجاد حیدر رہے۔ وہ طبعاً سنجیدہ تھے مگر رعونت ان کے پاس نہ پھٹکتی تھی۔ ان کی زندگی نامور حضرات کی زندگی سے بہ حیثیت سکریٹری وابستہ رہی۔ ان کی تحریریں بار ہا کرسیٔ صدارت سے نشر کی گئیں اور اخبارات میں تعریف کے ساتھ شائع ہوئیں۔ مگر بڑے بڑے قومی جلسوں میں جب جناب صدر اپنی تقریر پڑھتے تھے تو کسی کو کانوں کان پتہ نہ معلوم ہوا کہ اس تصنیف کا مصنف یہ ایک نحیف الجثہ شخص ہے جو گمنام شخص کی طرح اس مجلس کے ایک کونے میں بیٹھا اس طرح ادھر اُدھر دیکھ رہا ہے گویا اس تقریر سے اس کا کچھ واسطہ ہی نہیں۔ اپنے آپ کو گمنامی میں رکھنا "بڑا آدمی" کہلانے سے بھاگنا، بڑے آدمیوں کی صحبت چھوڑ کر بے تکلف گمنام دوستوں کے ساتھ وقت گذارنا اور ان کے ساتھ خوش طبعی میں خاموشی سے حصہ لینا سید سجاد حیدر صاحب کی ایسی خصوصیت تھی جو بہت کم افسانوں میں دیکھنے میں آتی ہے۔

ادیب۔ اگست ۱۹۴۳ء
جلد ۵ نمبر ۲

قاضی عبدالغفار

سجّاد — یلدرم

"جہاں پھول کھلتے ہیں اور گلاب کی خوشبو شام کے سایہ میں پھیلتی ہے — ایسی وادی کے خاموش گوشہ میں جہاں نہ دبدبہ ہو نہ وغدغہ، زندگی بسر کرنے کا لطف ہے۔ جب پھول کھلتے ہیں اور یہ کثیف اور ترش رو دنیا ہنسنے لگتی ہے ہوا میں حسنِ عشق سے مشابہ آہنگ ترم ایک اسرار انگیز خفیف روانی پیدا ہوتی ہے — جب فرشتہ گل شبو کے منھ کو کھولتا ہے اور بادلوں کو رنگین کرتا ہے — اُس وقت بہار کے موسم میں ایک شام کو مر جانے کا لطف ہے ا"

"جس وقت ہلکی ہلکی ہوا چلتی ہے اور وادی کی سطح کے زمردیں ٹیلوں پہ اور زمردیں دامنِ کوہ پہ بادلوں کا سایہ اس طرح آتا ہے جس طرح فرشتے آسمان پر اُترتے ہیں اور میری روح کو تلاش کرتے ہیں اُس وقت میری روح چاہتی ہے کہ پھولوں میں سے نکل کے بادلوں سے جا ملے اور میرا دل یہ چاہتا ہے کہ اُسی دامنِ کوہ میں ان ہی سرو کے درختوں کے سایہ میں میرے جسم کو دفن کر دیں۔ اور اگر میں اس قابل ہوں تو میرے لئے رونے والوں کے آنسو (کہ یہی میرے حسناتِ عمر کا نتیجہ ہونگے) اُس ہنستے کھیلتے دریا میں جو اس وادی میں بہتا ہے مل جائیں، نابود ہو جائیں!

....

پیدا ہوتے وقت رونا بہت اچھا! مگر نا امیدی کے ساتھ مرنا، اس کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی! ۔میں ایک پُرنشہ وداع کو غمگین وصال پر ترجیح دیتا ہوں۔ اور یہی سبب ہے آہ! یہی سبب ہے کہ چاہتا ہوں کہ دغدغۂ حیات کو بہار کے پُرشوق زمانہ میں جب پھول کھل رہے ہوں اور دُنیا میری طرف ہنس رہی ہو اور میں دُنیا کی طرف ایسے وقت میں اُس کو الوداع کہوں!!"

("جہاں پھول کھلتے ہیں" - حکایات و احساسات)

"دُنیا کی خوشی میں، سعادت و رفاہیت میں، اضافہ نہیں ہوگا مگر اندوہ و غم میں کمی ہو جائیگی، لایک محبت آلود وجود دنیا سے اُٹھ جائیگا ۔ سفالت و رذالت، تنعم و تعیش کی جنگ جاری رہے گی ۔ مگر دُنیا کے لئے کڑھنے والا ایک دل غائب ہو جائیگا!"

(میرے بعد)

محبت کا ایک قرضہ ادا کرنا چاہتا ہوں ــــ یہ جانتے ہوئے کہ وہ ادا نہیں ہو سکتا، بیتے ہوئے زمانہ کی یاد کو جگا رہا ہوں ــــ یہ جان کر کہ وہ زمانہ واپس نہیں آسکتا! ــ محفل دی شب کے ٹوٹے ہوئے جام و مینا کے ٹکڑے سمیٹ رہا ہوں ــ اس یقین کے ساتھ کہ وہ اب میری دسترس سے باہر ہیں!

آخری دفعہ ۱۹۴۲ء کے آخر اور ۱۹۴۳ء کے شروع میں سجاد سے ملاقات ہوئی تھی ۔ تقریباً (۱۷) برس کے بعد ہم دونوں لکھنؤ میں ملے تھے! اُن کی معنوی زندگی کے سمندر کا بہت سا پانی خشک ہو چکا تھا جس طرح میرا دریا بھی ایک چھوٹا سا چشمہ بن کر رہ گیا ہے! ۔ (۱۷) سال کے بعد میں نے اُن کو بہت ضعیف اور کمزور پایا، میرا پہلا سوال اُن سے یہی تھا ۔ سجاد! کیا تم بیمار ہو اور اپنی اُس زیرِ لب مُسکراہٹ کے ساتھ

(جس کی لذتِ دیرینہ سے اُن کے سب ہی احباب آشنا تھے!) اُن کا جواب یہ تھا۔ "ارے کچھ بھی نہیں بھائی! تھوڑی سی ذیابطیس ہے سو میں اُس کا علاج یوں کرتا ہوں کہ جی بھر کے مٹھائی کھایا کرتا ہوں! پرہیز اور احتیاط سے مرض کی خاطر داری نہیں کرتا!" —

— لکھنؤ میں یہ چند ہفتے اس طرح گزرے کہ ہم دونوں گھنٹوں اُن کی کوٹھی کے خاموش برآمدے میں بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے — وہ باتیں علیگڈھ کی! وہ باتیں! ادبیات اور شعر و شاعری کی! وہ باتیں گزرے ہوئے اور گئے ہوئے دوستوں کی! —

اس ملاقات سے چند روز پہلے نومبر ۱۹۴۲ء میں اُن کے عزیز ترین دوست سر محمد یعقوب کے لئے اپنے خالق کا بلاوا آچکا تھا! اس حادثہ کی نسبت سجاد حیدر نے بطور تعزیت مجھے ایک خط لکھا! اس خط میں دو سطریں نثر کی اور چند اشعار تھے — "ایک ہمدم دیرینہ کی یاد میں" — ان اشعار میں جو کچھ انھوں نے اپنے "ہمدم دیرینہ" کے لئے لکھا تھا اُس کو آج تقریباً ڈیڑھ سال بعد میں اُن کی جدائی میں اپنے غمگین جذبات کا ترجمان بنا سکتا ہوں۔ ۲۱۔ دسمبر ۴۲ء کو وہ مجھے لکھ رہے تھے کہ:

"تمھیں میں تعزیت نامہ کیا لکھوں۔ ہمدم دیرینہ کی یاد میں تعزیت بھی ہے اور دوستوں کو چھوڑ کر چلے جانے والے دوست کے نام ایک پیام بھی۔ . . . .

سر محمد یعقوب کی قوم پرستی کی نہیں احباب پرستی کی یاد مجھے

"تڑپا رہی ہے !۔ تمہارا سجاد"

اس عبارت کے بعد اُس "شکوہ" کا انداز دیکھئے جو مرحوم نے اپنے "ہمدمِ دیرینہ" سے کیا تھا اور اب اُن کے احباب خود اُن سے کر رہے ہیں:

اے دوست دیا ساتھ نہ احباب کا تم نے ۔۔۔ یہ شرطِ رفاقت تھی کہ ہمیں چھوڑ گئے تم
مضبوط پکڑتے تھے سرِ رشتۂ الفت ۔۔۔ یہ کیا کہ جھٹک کر اُسے خود توڑ گئے تم

اے عالمِ فانی سے نظر پھیرنے والے
ہے کوئی کشش تجھکو یہاں پھر جو بلا لے؟

وہ ڈوب گیا جس نے ہزاروں کو اُبھارا ۔۔۔ کس کس کو دیا ہمتِ عالی سے سہارا
یعقوب سا اب کوئی نہ آئیگا دوبارا ۔۔۔ شیریں سخن و دوست نواز، انجمن آرا

وہ جو کہ لٹا دیتا تھا احباب پہ دولت
وہ پیکرِ اخلاص وہ تمثالِ محبت۔!

احباب پرستی کا نمونہ تھے تو تم تھے ۔۔۔ احباب فراموشوں کو شرماؤ تو آکر
یعقوب بھی احباب فراموش ہی نکلا ۔۔۔ اس طعنۂ دلدوز کو جھٹلاؤ تو آکر

آرام سے کیوں زیرِ لحد جا کے ہو لیٹے
اپنے کو بچاتے ہوئے دامن کو سمیٹے

بیکار ہے بیکار ہے اخلاص و محبت ۔۔۔ اب کوئی نہ ہوگا سرِ جادۂ الفت
وہ مدعیٔ رہبریٔ راہِ محبت ۔۔۔ کہتا تھا زمانہ کہ وفا اُسکی ہے خصلت

یوں چھوڑ چلا جیسے شناسا ہی نہ تھا وہ
اس طرح گیا جیسے کہ آیا ہی نہ تھا وہ

میں اگر شاعر ہوتا تو شاید یہی سب آج سجاد مرحوم کے متعلق لکھتا۔ لیکن میں کتنا ہی لکھتا، کتنا ہی لکھتا رہوں، وہ قرضہ کبھی بھی ادا نہیں کر سکتا جو ایک عزیز دوست اور ایک بے مثل ادیب اور ایک نازک خیال مفکر کا میرے ذمہ عاید ہوتا ہے! اس قرضہ کو میں قرضہ صرف اس لئے نہیں سمجھتا کہ سجاد مرحوم اُردو زبان میں ایک نئے اور ترقی پسند اور بہت ہی دل نواز اسلوبِ بیان کے موجد تھے اور اس لئے وہ خراجِ تحسین کے حق دار ہیں، بلکہ زیادہ تر اس لئے کہ اُن کے ادبی ذوق سے میرے ادبی رجحانات نے اپنے آغازِ کار میں بہت کچھ حاصل کیا۔

سجاد کا ادب جوان ہو چلا تھا۔ جب میری مضمون نگاری اپنی طفولیت کی منزل پر تھی۔ اُس منزل پر جہاں اگر اخبار یا رسالہ کسی نو مشق کا کوئی اچھا یا بُرا مضمون شائع کر دے تو اُس کے لئے یہ واقعہ ایک طُرّۂ افتخار ہو جائے! اور تمنّا یہ ہو کہ اُس نو آموزِ لذتِ گفتار کے دوستوں کے حلقہ میں کوئی ایک ایسا دوست باقی نہ رہ جائے جو اُس کا چھپا ہوا مضمون نہ پڑھ لے! چھپ کر شائع ہو جانے اور اپنے نام کو "زیورِ طبع" سے آراستہ دیکھنے کی خواہش نو آموز مضمون نگاروں کی زندگی کا کس قدر عزیز سرمایہ ہوتا ہے! جس زمانہ میں سجاد مرحوم کے مضامین مخزن میں شائع ہو رہے تھے میں اُن کو بار بار پڑھا کرتا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اُن کے ذہنی نقوش کو چُرا چُرا کر اُن سے اپنے مضامین کو سجایا کرتا تھا۔ سجاد کے اندازِ بیان کی دل فریب پرچھائیاں

چوری کے مال کی طرح میری گرہ میں آتی تھیں اور مجھے یقین ہے کہ آج تک بھی میری تحریروں میں سجاد کے اندازِ بیان سے میری ابتدائی خوشہ چینی کا اثر باقی ہے۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ مرحوم کی ادیبانہ زندگی کے نقوش کو ـــ جس سے میرا انتساب میرے لئے قابلِ فخر ہے ـــــ منظرِ عام پر پیش کر کے میں محبت اور عقیدت کا ایک فرضہ ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ مضمون اُس قرضہ کی پہلی قسط ہے ممکن ہے کہ یہی مضمون یلدرم کے کسی سوانح نگار کے لئے ایک پیش لفظ بن جائے۔

سجاد مرحوم میرے ہم سبق نہ تھے۔ جس طرح ادب کی دُنیا میں، اسی طرح علیگڑھ میں وہ مجھ سے پہلے آئے اور پہلے فارغ ہوئے۔ لیکن چند سال کا یہ فرق اُن روحانی تعلقات نے مٹا دیا تھا جو ادبی افکار کے توسط سے پیدا ہوئے تھے اور تقریباً (۳۵) سال قائم رہے ـــ اُس وقت تک قائم رہے جب تک کہ موت کی بے پناہ مقراض نے اس ریشمی ڈوری کو کاٹ نہ ڈالا! آخر ۱۹۴۲ء اور شروع ۱۹۴۳ء کی وہ ملاقاتیں میری نظروں میں پھر رہی ہیں! لکھنؤ سے چند ہفتوں کے لئے یہ کہہ کر رخصت ہوا تھا کہ واپس آکر تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں، سجاد! لیکن جب واپس آیا تو معلوم کہ سجاد میرا انتظار نہ کر سکے۔ وہ تین چار دن پہلے ہی ایک دن صبح کو اس فانی دُنیا سے منھ موڑ کر آسودۂ خوابِ ابد ہو گئے! لکھنؤ میں وہ میرا انتظار نہ کر سکے

لیکن اُس دائمی صبحِ ازل میں جہاں خواب اور بیداری کا کوئی فرق باقی نہیں رہتا اب وہ انتظار کرینگے ـــ اپنے بعد میں آنے والے بہت سے دوستوں کا!

سجاد حیدر صوبجات متحدہ میں ضلع بجنور کے رہنے والے تھے ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ چند سال علیگڑھ کالج میں تعلیم پائی اور ۱۹۰۱ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ علیگڑھ میں وہ مولانا محمد علی مرحوم کے ہم سبق تھے۔ مولانا اُن کو بہت چاہتے تھے اور جس زمانہ میں دہلی سے اخبار "ہمدرد" جاری کیا جانے والا تھا مولانا نے اُن سے بہت اصرار کیا کہ وہ اُن کے اخبار کی زمامِ ادارت سنبھال لیں۔ لیکن سجاد کی طبیعت کے رجحانات اخبار نویسی اور اُس کے متعلقات کی کشاکش سے بہت دُور تھے۔ اُن کی فطرت زندگی کا کوئی خاموش گوشہ چاہتی تھی جہاں وہ اپنے افکار کی دُنیا بسا کر

بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کئے ہوئے!

لیکن دُنیا ستم کار اور ستم ظریف ہے، سجاد جن ہنگاموں سے دُور بھاگا کرتے تھے اُن سے بدتر پابندیوں میں مبتلا ہو گئے۔ بجائے اس کے کہ ادب کی قلمرو میں ـــ جو اُن کی حقیقی قلمرو تھی ـــ اُن کا سکہ چلتا، وہ چاکری کے چند کھوٹے سکوں کے لئے ایک ایسی دُنیا میں قید کر دئے گئے جہاں "مجموعۂ تعزیرات ہند" گویا اُن کی زندگی کے افکار کا آئینہ دار بن گیا!! غلاموں کے ملکوں کا یہی سب سے بڑا حزنیہ ہوتا ہے کہ ہرن

اصطبل میں باندھے جاتے ہیں! مولانا محمد علی مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہ سجاد اخبار نویسی کی دُنیا میں قدم رکھنے پر آمادہ نہ ہوئے یہ کہہ کر بہت پُرلطف اشارہ کیا تھا کہ "وہ ادب کے لئے وضع کئے گئے، اور ہم بے ادبی کے لئے"

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
او بہ صحرا رفت و من در کوچہ ہا رُسوا شدم

کوچہ و بازار میں محمد علی کا وہ "رُسوا" ہونا اور چاکری کے لق و صحرا میں سجاد کے کاروانِ ادب کا لُٹ جانا ہماری زبان کی تاریخ کے دو بڑے واقعات، بلکہ حادثات ہیں جن سے ایک انقلابی ہندوستان کا مورخ عبرت حاصل کرے گا۔ اگر محمد علی کی خدا داد صلاحیتیں قلم اور کاغذ کے لئے وقف ہو جاتیں اور اگر سجاد کی "ڈپٹی کلکٹری" اُن کو حُسنِ خیال کی وادیٔ گُل ریز سے خارج البلد نہ کر دیتی تو نہ جانے ہماری زبان کے خزانے زر و جواہر سے کس قدر معمور ہو جاتے۔ فکر و خیال کی کتنی بستیاں آباد ہوتیں ــــ اس ریگستان میں کتنے نخلستان سرسبز ہوتے اور کتنے دریا بہتے!! "یلدرم" کی فطری شعریت کا اگر یہ حشر نہ ہوا ہوتا تو نہ جانے آج دُنیا ہندوستان کے اس "نامق کمال" کے نزاوش افکار سے کس قدر مالا مال ہوتی! لیکن پھر بھی جو ادبی میراث سجاد نے اپنے ہمزبانوں کے لئے چھوڑی وہ کچھ کم تو نہیں۔ اُن قطروں میں ایک سمندر، اُن چند دانوں میں دہقان کی آرزو کے تمام حاصلات، اُس ایک

آہ میں غم کی ساری دُنیا، اور اُس ایک تبسم میں گلبانگِ حیات کی تمام موسیقی! — یہ سب وہ اپنے چند اوراق میں ہمارے لئے چھوڑ گئے!!۔

سجاد نے ادبِ لطیف اور مفکرانہ اور فلسفیانہ ادب کا نیا اسلوب اُردو زبان میں پیدا کیا جس کا سرچشمہ ترکوں کی زبان کے متعلق اُن کا وہ ادبی ذوق تھا جس نے ترکی ادب کے ایک انقلابی دَور سے اُن کا رشتہ باندھا۔ وہ انقلابی دَور جو "نامق کمال" اور خالدہ ادیب جیسے مفکرین کا دَور تھا۔ اس وقت تک ہندوستان کی زبانوں کا ادب اس حقیقت سے آشنا نہ تھا کہ کسی قومی ادب کو قومی انقلاب سے کیا نسبت ہوا کرتی ہے۔ ابھی تک "ادب برائے ادب" کے تھکے ہوئے تصورات اُس "جنت نگاہ اور فردوس گوش" کے معمار بنے ہوئے تھے جس جنت کے دروازے پر عظیم الشان انقلابات کی ایک نئی دُنیا کا نقشہ بنایا جا رہا تھا! اپنے حجروں میں جن کے بھاری پردے گرے ہوئے تھے ہماری دُنیا کے اربابِ قلم بالکل آسودہ تھے اور اُن کو خبر نہ تھی کہ اُن کے حجروں کے باہر ایک طوفان آنے والا ہے! ترکی میں انقلاب کی پہلی لرزش پیدا ہو چلی تھی اور وہاں ترقی پسند ادب کے داعی میدان میں آنے لگے تھے۔ عین اُسی وقت یلدرم "ترکی ادب کی اس نئی دُنیا سے آشنا ہوئے جب کہ ترکی ادب کی اس بے چین روح کو "ادب برائے زندگی" کی صبح صادق کے دھیمے آفتاب کی پہلی کرن نے مس کیا تھا! سجاد کی

فطرت نے ترکی ادب کی روح سے جو کچھ حاصل کیا اُس کو اُردو ادب کی تھکی ہوئی محفلوں تک پہنچانے کے لئے انھوں نے سب سے پہلے اُس زمانہ کی ترکی ادبیات کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ اس طرح وہ اُردو ادب میں ایک نیا تصور، ایک نیا اسلوب، ایک نئی زندگی منتقل کرنے لگے۔
غالباً اُن کا سب سے پہلا ترجمہ ترکی ناول ہاجرہ کا ترجمہ تھا مگر یہ کتاب ترکی ادب کی کچھ زیادہ خصوصیات کی حامل نہ تھی۔ میں تاریخوں کا صحیح تعین تو نہیں کر سکتا لیکن غالباً ۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۰ء میں دوسری دفعہ ترکی ادیب احمد حکمت کے افسانے "ثالث بالخیر" کا ترجمہ سجاد کے قلم سے اُردو زبان کا لباس پہن کر ہماری زبان کے ادیبوں کے لئے ایک نیا پیام لایا۔ ان اوراق کے دیباچہ میں انھوں لکھا تھا کہ:

"میری تمنا تھی کہ کسی طرح ترکوں کے قصے ترجمہ ہوں۔ اس سے نہ صرف ہمارے ناولوں کے لٹریچر میں ایک نئے قسم کا اضافہ ہوگا بلکہ ترکوں کی سوشل زندگی کا اصلی نقشہ بھی ہمیں نظر آئے گا۔ ترکوں کی سوشل زندگی کی تصویر کی میں اُردو میں اس لئے ضرورت سمجھتا تھا کہ ہماری سوسائٹی اور طرز معاشرت میں جو انقلاب پیش آ رہا ہے وہ انھیں بھی پیش آ چکا ہے اس وجہ سے ہمیں اس نقشہ سے معلوم ہو جائے گا کہ اس منزل سے وہ کس طرح گزرے اور اب کہاں ہیں .... مغربی معاشرت کے

دل دادہ تو اس قصے کو پڑھ کر شاید خوش ہوں گے مگر
مخالفین تو یقیناً مکدر ہوں گے۔ اُن کی خدمت میں
عرض ہے کہ کیا کیا جائے زمانہ کا یہی رنگ ہندوستان پہ
چڑھ رہا ہے۔ ترجمہ اکھڑا اکھڑا اور انوکھا معلوم ہوگا مگر
ترکوں کا طرز ادا مجھے کچھ ایسا بھلا معلوم ہوتا ہے اور مغربی
اور ایشیائی طرز تحریر کا کچھ ایسا اچھا امتزاج ہے کہ میں نے
لفظی ترجمہ کی کوشش کی ہے۔ گفتگو انوکھی تو ضرور ہے
لیکن سُنئے تو

غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

۱۴ اگست ۱۹۲۰ء

آج سے (۴۲) سال پہلے جس اسلوب بیان کو "اکھڑا اکھڑا اور
انوکھا" کہہ رہے تھے وہ آج ترقی پسند ادب کے ساتھ ساتھ ہماری ادبیات کی
ایک نمایاں خصوصیت بن گیا ہے۔ ہمارا ادب اب جن حقایق کو زیادہ
گرم اور زیادہ کھلے ہوئے الفاظ میں ہمارے سامنے لا رہا ہے اُسی کا
ایک دھیما اور معتدل آغاز ہم سجاد حیدر کے ابتدائی ترجموں میں پاتے ہیں
اُس پہلی منزل کے بعد خود سجاد نے ترقی پسند ادب کی بہت سی منزلیں
طے کیں اور اگر سرکاری ملازمت کی زنجیروں نے اُن کے افکار کو باندھ
نہ لیا ہوتا تو کیا معلوم ہے کہ آج وہ جدید ادب کی کس منزل پر ہوتے
۱۹۲۵ء میں انھوں نے نامق کمال کے طویل ڈرامہ جلال الدین خوارزم شاہ کا

ترجمہ پیش کیا۔ نامق کمال اپنے زمانہ کے انقلابی اور ترقی پسند ادیبوں میں بلاشبہ سب سے بڑا ترکی ادیب تھا۔ اُس کے متعلق خود سجاد اپنے مختصر دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ

”نامق کمال یک ترکی ادبیات جدیدہ کے زندہ جاوید بانیوں میں سے ہے۔ وہ، وہ ہے جس کے حیات آفرین قلم نے بہ قول پروفیسر براؤن وطن کے عام لفظ کو محض زاد و بوم کے مفہوم سے بلند کر کے عشق ملک و ملت اور دین و مذہب کا حامل کر دیا میں اس ڈرامہ سے جتنا متاثر ہوا ہوں اگر اُس کا عشر عشیر اثر بھی ناظرین کے دل میں پیدا کر سکتا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت وصول ہو گئی۔“

اس کے علاوہ ”مطلوب حسینان“ ”زہرہ“ ”آسیب الفت“ یہ تینوں بھی ترکی افسانوں کے ترجمے ہیں جو یکے بعد دیگرے شائع ہوئے مگر سب سے زیادہ نامق کمال کے ڈرامہ نے سجاد کا رشتہ ”ادبیاتِ جدیدہ“ سے مضبوط کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں ”حکایات و احتساسات“ کے عنوان سے اُن کے مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا جس میں کچھ ترجمے خالدہ ادیب کے مضامین کے اور کچھ دیگر ترکی مصنفین کے شامل ہیں۔ مگر ان کے علاوہ چند طبع زاد مضامین بھی ہیں جو ہمایوں علیگڈھ میگزین اور مخزن میں شائع ہو چکے تھے۔ یہ ”خیالستان“ کے سلسلہ کی دوسری کڑی تھی۔ ”خیالستان“ پانچویں دفعہ ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی تھی اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب کے بعض مضامین ”یلدرم“ کے

شاہکار ہیں جن میں جدید ترکی ادب کے بہترین تاثرات کو انھوں نے اُردو ادب کے طبع زاد اور جدید پیرایہ میں مجتہدانہ پیش کیا اور اس نقطہ سے اُردو کے ادب میں وہ نئی راہ پیدا کی ہے جس پر آج ترقی پسند ادب کے قافلے رواں دواں ہیں۔

جو کچھ سجاد کی فطرت نے ترکی ادب سے حاصل کیا اور جو کچھ خود اُن کی فطرت میں ودیعت تھا ان دونوں کے امتزاج کا بہترین نتیجہ "خیالستان" اور "حکایات و احتساسات" میں حاصل ہوتا ہے۔ کہیں کہیں سے چند جواہر ریزے نقل کرتا ہوں۔ زبان اور بیان کی لذتوں سے قطع نظر پہلے اُن افکار پر نظر کیجیے جن میں سجاد کی روح بے قرار نظر آتی ہے۔ اپنی ادبی کاوشوں کے درمیانی دور میں جب اُن کی آرزومند روح دنیا کی کشاکش سے مجروح ہو چکی ہے [illegible] ترنم کے ہزار [illegible] اپنے تاثرات کی ترجمانی کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ :-

"مجھے اعتراف کرنا ہے۔ حرص جاہ و مال و ہوس نفس سے
مغلوب ہو کر وہ شعلہ جو مجھ میں کبھی ــــ اور یہ زندگی کے
علوی لمحے ہوتے ہیں ــــ تیزی سے بھڑکتا ہے
افسوس کہ اکثر ــــ اور جس زمین سے ہم مربوط ہیں اس
زمین میں وہ بیشتر سفلی ہی ہے ــــ بہت دھیما رہتا ہے
گو شکر ہے کہ بجھتا نہیں، ورنہ خدا کرے کہ جس دن یہ شعلۂ قلب
میری بے جھمتی سے مجھے اُسی دن بلکہ اُسی لمحہ یہ شمع حیات بجھی

مکمل ہو جائے ....

یہ شعلہ یہ لاہوتی لو جو مجھے چھوڑے جا رہا ہے، مجھے خود اس کا احساس ہو رہا ہے۔ یہ ملوث محیط جس میں میں تیر رہا ہوں زیادہ کثیف زیادہ غلیظ ہوتا جا رہا ہے! واعظ کا وعظ اور نقیب کی ہیجان انگیز صدا میرے پاس سے اثر کئے بغیر گزر جاتے ہیں ...."

"ویران صنم خانوں" کے عنوان سے زندگی کے حقائق کا تجزیہ کرتے ہیں اور اپنے وجدان کا مشکل راستہ طے کر کے فکر و نظر کی اُس منزل پر پہنچتے ہیں جہاں یہ حقیقت زندگی کی حقیقت اُن کو مایوس کر دیتی ہے ——— فرماتے ہیں:-

"طفلی و عشق کے ویران معبدوں کو چھوڑ کر میں آگے بڑھا۔ افکار و احساسات کے نادیدہ اُفقوں کی طرف زندگی ڈراونی تیزی کے ساتھ مجھے لے گئی اور میں نے دوسروں کے معبد کے دروازوں میں سے اندر جھانکا۔ مگر میری نگاہ نے نہایت گہرے پردوں میں سے گزر کر دیکھا تو یہ دیکھا کہ ہر جگہ ویران معبدوں کے سوا کچھ نہیں۔ قلب نے بھی کہا کہ میں کبھی تجلی گاہِ ارمان تھا۔ کبھی! وہ علوم جس کے لئے علماء سر کھپا رہے ہیں، وہ سوز و گداز بشری جس کی ترجمانی شعراء کرتے رہے ہیں، دوستی، عشق، دین، فکر بشر،

سب کے سب آخرین دیکھیے تو ویران معبد ہی نظر آئے۔
دماغ وقلب کے ویران صنم خانے!
اب اُن مین حسرت و یاس و تمنا سیر کرتے ہین!

سجاد کی زندگی کا کربِ روحانی — جس کا بڑا سبب غالباً یہ تھا کہ وہ اُن کی زندگی اُن کے فطری ماحول سے بہت دُور پھینک دی گئی تھی — اُن کے مضامین مین بار بار ظاہر ہوتا ہے اور وہ اپنے ادبی ذوق کی پُرکیف اور مست جوانی کو ایک ایسے بے پناہ بوڑھاپے مین منتقل ہوتے دیکھتے ہین — اس انحطاط کا ماتم کرتے ہین — جس نے اُن کی شعریت کو تباہ کر دیا! جب ہی تو اپنی فطرت کے اس مزار کے سرہانے بیٹھ کر وہ انسانون کے ویران صنم خانون کا مرثیہ لکھتے ہین!

مین اگر سجاد کا سوانح نگار ہوتا تو اُن کے مضامین پر تبصرہ کرنے سے پہلے کسی نہ کسی طرح یہ بھی پتہ چلاتا کہ اُن کا ہر مضمون کب اور کس ماحول میں لکھا گیا۔ اُس وقت مین بتا سکتا کہ وہ خود اپنی زندگی کے حوادث سے کس حد تک متاثر ہوئے تھے اور کس طرح اُن کی فطرت نے ان حوادث سے مجروح ہو کر ایک بلند پرواز ادیب کو "حسرت و یاس و تمنا" کے تاریک اور ویران صنم خانہ تک پہنچایا تھا۔

اپریل ۱۹۲۳ء مین رسالہ ہمایون نے اُن کا ایک مختصر مضمون شائع کیا تھا جس کا عنوان "قوت" تھا۔ ان چند سطرون میں ہم ایک طعن آمیز تمثیل کا پیرایہ دیکھتے ہین۔ وہ مضمون زمانہ کے حالات پر گویا ایک

SaTIRE ہے جس کے کانٹوں کے نوک بہت تیز ہے۔ ہم ان سطور میں سجاد کو ہندوستان کے حالاتِ حاضرہ پر تحقیر کی نظر ڈالتے دیکھتے ہیں۔ اُن کے قلم کے ان کانٹوں کے نوک پر ہیں اُن کے خونِ دل کی سُرخی نظر آتی ہے اِ۔ لکھتے ہیں :۔

" گلی کے کنارے میں اُس مجمع کو اکثر دیکھا کرتا تھا۔ مزدوروں کے قلیوں کے لڑکے غول کے غول دوپہر کو وہاں کھیلتے ہوتے تھے۔ وہ آپس میں الجھتے تھے چیختے تھے۔ چلاتے تھے۔

ایک دن میں اُس راستہ سے گزر رہا تھا۔ لڑکوں کا مجمع تو تھا مگر کھیل نہ تھا بلکہ وہ حلقہ باندھے کسی چیز کا تماشا دیکھ رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مزیدار تماشا انھیں بہت لطف دے رہا ہے۔ سب کے چہروں پر مُسکراہٹ تھی۔ میں نے دیکھا کہ جیسے وہ ذوق و شوق سے دیکھ رہے تھے وہ ایسا تماشا تھا جو غالباً اُن کی تفریحِ طبع کے لئے روز ہوتا ہوگا۔ ایک بڑا لڑکا جو سب میں سب سے زیادہ معلوم ہوتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ قریب قریب جوان ہو چکا تھا متکبرانہ بیچ میں کھڑا تھا اور ایک چھوٹا لڑکا اُس سے دست و گریبان ہو رہا تھا۔ بڑا لڑکا چھوٹے کو چھینٹا رہا تھا اور غلیظ گالیاں دے دے کر

اپنے سے علیحدہ کر رہا تھا چھوٹا لڑکا گھونسے کھا رہا ہے، تھپڑ کھا رہا ہے۔ بڑے لڑکے کے ہر جھٹکے سے زمین پر گر پڑتا ہے۔ ہر گھونسے پر ہائے کی آواز اُس کے منھ سے نکلتی ہے، مگر گر گر کر اُٹھتا ہے، روتا جاتا ہے۔ رونے سے اور گرنے سے اُس کے بال اُس کا چہرہ خاک آلود ہو رہے ہیں لیکن وہ پھر بڑے لڑکے سے غصہ میں لپٹ جاتا ہے۔ ہچکیاں بندھ رہی ہیں مگر کہے جاتا ہے "میری ہے لاؤ!" یہ کہہ کر ایک قمچی کو بڑے لڑکے سے چھیننا چاہتا ہے۔ طنبیہ حق کے مقابلہ میں اُسے ایک گھونسا۔ ایک لات لگتی ہے جسے کھا کر وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹتا ہے مگر پھر آگے آتا ہے۔ رونے اور چیخنے کی وجہ سے اُس کی آواز بیٹھ گئی ہے، اُس کا ضعف بڑھتا جا رہا ہے لیکن اپنی قمچی بڑے لڑکے سے واپس لینے کی کوشش کئے جا رہا ہے۔ آخر کار اُس پر ایک ایسا تھپڑ پڑا جس سے وہ بھنا گیا اور چکر کھا کر زمین پر آ رہا۔ اب اُس میں اُٹھنے کی قوت نہ رہی تھی۔ کمزوری سے زمین پر پڑا رو رہا تھا اور بڑے لڑکے کو گالیاں دے رہا تھا مگر بڑا لڑکا جبر و قہر سے حاصل کی ہوئی قمچی کو مفتخرانہ انداز سے ہلا ہلا کر اُس چھوٹی مخلوق کے (جو حلقہ باندھے کھڑی تھی اور قوت کے مقابلہ میں عاجز کو ہیچ جانتی تھی) قہقہوں

اور نالیوں میں جھومتا ہوا چلا گیا۔

عین اُس وقت اُس منظر کے اوپر سے ایک کوا
جس نے ایک آشیانہ شفقت میں گھس کر ابھی ابھی انڈوں کو
چھوڑا تھا اور انھیں کھا کر شکم سیر ہوا تھا مصنوعی فرار کے
انداز سے گزر رہا تھا اور غیض مادرانہ میں بھری ہوئی ایک
مینا سادہ لوحی سے ٹھونگیں مارنے کی کوشش کر کے
قوت اور حیلہ کو اپنے زعم میں مجروح کر رہی تھی!!"

۱۹۲۳ء تک ہندوستان کے گزرے ہوئے دس بارہ سال کی روئداد کی
طرف یہ ایک طنز آمیز اشارہ ہے اُس عجز اور بے کسی کی حالت کی طرف
جس حالت میں وہ شاید خود اپنے وجود معنوی کو بھی دیکھ رہے تھے۔
اس تمثال کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ سجاد کی سریع الحس روح ملک
سیاسی کش مکش سے بہت دور رہ کر بھی کتنی قریب تھی!

خیالستان سجاد کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اور ان کی رومانیت
اور تخیل کا بہترین عکس ہے وہ بلا شبہ اُردو ادبیات کے جواہر خانہ میں
ایک بہت قیمتی ہیرے کی انگوٹھی ہے۔ ان اوراق میں سجاد اپنی قوتِ فکر
اور رعنائی بیان کے اعلیٰ ترین درجہ تک پہنچے ہیں۔ کاغذ کی سطح پر
اُن کی فکرِ فلک پیما نے رومانیت کی روح کے ہزار ہا جلووں کو بے نقاب
کیا ہے اور اُن کی قلم کی نقاشی نے اپنے دل نواز نقش و نگار بنائے ہیں

جن کی نوکِ قلم میں افکارِ لطیف کی ایک دُنیا آباد ہے۔ جہاں کہیں وہ مناظرِ فطرت کا عکس اپنی روح کے آئینہ میں دیکھتے ہیں وہاں اُن کی تحریروں کا پڑھنے والا اُن کے وجدان کی موسیقی میں محو ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً خارستان و گلستان کا پہلا منظر پیش کرتے ہیں :۔

فضا میں خاموشی، بے پایاں سمندر، ڈراؤنی خاموشی،
وحشت انگیز سکوت، کوئی صدا نہیں، کوئی اثرِ حیات نہیں،
ایک غیر محدود مگر روشن تنہائی، ایک مختصر سکون ـــــ
یہ عالم ہے! ۔ چاند خاموشی کے ساتھ گویا سوچ رہا ہے،
موجیں سوچ رہی ہیں، چاند کی کرنوں کے سیلاب سے بچا ہوا
شاید سوچ رہا ہے، بادلوں کے منتشر ٹکڑے سوچ رہے ہیں
ـــــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا اس خاموشی کا بھید
چپکے چپکے سمندر کے کان میں کہنا چاہتی ہے اور نہیں کہہ سکتی!۔
سمندر کا سینہ سانس لینے کی کوشش کرنا چاہتا ہے ـــــ
تمام موجودات میں گویا ایک کروٹ لینے کی خواہش معلوم
ہوتی ہے ـــــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بے پایاں
سُستی اور سکوت میں اگر کہیں سے ذرا سی صدا بھی آجائے تو
دُنیا ہنس پڑے گی ـــــ اچھل پڑے گی!!"

خارا اور نسرین کی پہلی ملاقات کے منظر کا ایک ٹکڑا دیکھئے :۔
"یہ جزیرہ گو کہ بے انتہا خوب صورت تھا۔ لیکن ایسا

معلوم ہوتا تھا کہ ایک گران خواب میں سو رہا ہے اور ہمیشہ سے
کسی چیز کا انتظار کر رہا ہے۔ ان دونوں کا ایک دوسرے کا
بوسہ تھا کہ جزیرہ کے پرندے چہچہا کر اڑنے لگے۔ تمام کلیاں
ایک دم کھل گئیں۔ ایک گردباد آہنگ و رنگ، ایک
زمزمۂ جوش و خروش نے کل جزیرہ کو گھیر لیا.........
پہلے نسرین ہوش میں آئی تو دیکھا کہ اس کے ہونٹوں پر جہاں
خارا نے بوسہ لیا تھا ایک پھول کھلا ہوا ہے!"

سجاد کی ادبیت کا شاہکار میری رائے میں خیالستان ہے اس کے بعد
دوسرے افسانے اور مضامین، جو خاص خاص موضوعات کو مرکزِ نظر بنا کر
لکھے گئے ہیں۔ اُن میں زیادہ تر ایک دھیما طنز اثر پیدا کرتا ہے اسلوبِ بیان
"خیالستان" کی نسبت سے سادہ ہے یعنی گل کاری کم ہے مگر چٹکیاں کم نہیں
ہیں۔ مثلاً "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" میں ایک مضمون نگار اپنے
احباب کی کثرت کا شکوہ سنج ہے۔ "صحبت ناجنس" میں دو لڑکیوں کی خط و
کتابت کو اُس درد و کرب کا پیامی بنایا گیا ہے جو شوہر اور بیوی کے مذاق کے
اختلاف سے پیدا ہوتا ہے۔ اس افسانہ میں سجاد نے مزاحی اور طنزیہ
انداز بیان کو اپنے بہترین اسلوب میں پیش کیا ہے اور سماج کے ایک
بڑے گناہ کو اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ پڑھنے والا اس نگارش کی
ادبیت سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے اور اُس کانٹے کی خلش بھی محسوس
کرتا ہے جس سے ہماری سماج میں ازدواجی زندگی کبھی کبھی بے آہنگ

ہو جاتی ہے اور اکثر تلخ آہنگ ! عذرا اپنی سہیلی سلمیٰ کو اپنے شوہر کا حال لکھتی ہے :-

"وہ لڑکپن کی اُمیدیں ایک لال کی ہلکی پرواز کی طرح غائب ہوگئیں، ایک چھوٹی چڑیا کی طرح اُن کا خون ہوگیا!۔ بیاہ کا تیسرا یا چوتھا دن تھا۔ میں پیانو کے پاس بیٹھی تھی وہ مجھ سے ذرا دُور آرام کرسی پر ڈھیر ہو رہے تھے، میں یوں ہی بیٹھی بیٹھی پیانو کو بجا نہیں رہی تھی بلکہ کھیل رہی تھی کہ میرے کانوں میں وہ بھاری اور کرخت آواز آئی "ہم سُنتے ہیں آپ اچھے گاتی ہیں، اگر دو ایک ہم کو سنائیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

میں رُکی اور استعجاب آمیز انداز سے اُن کی طرف دیکھنے لگی معلوم نہیں کہ اُس نظر کے انھوں نے کیا معنی لئے کہنے لگے :-

"کوئی راگنی کوئی ٹپہ کوئی غزل ہمارے واسطے ہونا ! ہم یہ نہیں کہتا کہ کیا سُناؤ۔ آپ کو جو پسند ہو وہ سُناؤ۔"

میں مبہوت نظر سے دیکھ رہی تھی اور اُس تقریر کو سُن رہی تھی، وہ پھر فرمانے لگے :-

"اچھا اور کچھ نہیں تو یہ غزل تو سُناؤ :

دونوں ہاتھوں میں مہندی لگائے پری !"

مین کیا جواب دیتی حیران تھی، وہ مسلسل گانے کی چیزین

پیش کرتے جاتے تھے۔

"اچھا صاحب! غزل نہین تو کوئی ناٹک کی چیز:۔

"دیتا ہون تجھ کو تختِ سلیمانؑ کی قسم!"

(اور اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر پورے جوش اور نہایت محبت

اور حرص بھری نظر سے مجھے دیکھ کر)

"مل مجھ سے اے پری تجھے انسان کی قسم!"

مجھے چپ لگی ہوئی تھی، آخر وہ اُٹھ کر پیانو کے قریب آگئے

اور فرمانے لگے :۔

"صاحب! کیا غضب ہے مین اس قدر التماس کیا ہون

آپ قبول نہین کرتے! مہربانی کر کے مدارس لال یا امانت کی

کوئی چیز آپ سُنا دین گے تو کیا ہوگا!"

ایسے ہی چند دل دوز لطیفے سُنا کر عذرا لکھتی ہے:۔

"سلمیٰ! سلمیٰ! آ میرے حالِ زار کو دیکھ! کھانے کے بعد

متواتر زور زور سے ڈکار لینے والے آدمی کے ساتھ

زندگی بسر کر رہی ہون کل جو خیال آیا تو دن بھر رویا کی،

پیٹ پر ہاتھ پھیر کر اونٹ کی طرح ڈکار لینا ————

عا! عا! اف غضب!...... یہ آنکھین یہ ڈکار۔

یہ آواز یہ "دونون ہاتھوں مین مہندی لگائے پری کا

عشق! کچھ نہیں سوجھتا کہ کہاں پناہ لوں! ....
وہ ایک سیاہ ابر کی طرح گھر پر چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے
..... کیا عمر یوں ہی گزرے گی؟

اس افسانے میں سجاد نے ہماری سماج کے ایک دل خراش حزنیہ کو طشت از بام کیا ہے۔ اور اسی طرح "چڑیا چڑے کی کہانی" میں چڑے کی زبان سے اور اسی طرح "نکاح ثانی" میں ایک نوجوان عروس اور ایک بازاری عورت کی گفتگو میں مرد کی زندگی کے متعلق عورت کے جذبات کی ایک نازک اور لطیف تصویر کھینچی ہے۔ اس افسانہ میں نفسیات گناہ اور شرافت جنسی کا ایک لطیف پہلو نمایاں کر کے ـــــ اخلاقی حسن اور بدصورتی کے تقابل پر اپنا ضرور قلم صرف کر کے ـــــ انھوں نے مرد کی جنس آلودگیوں کے دھبے دھوئے ہیں۔ افسانہ کا آخری منظر وہ ہے جب نوجوان بیوی اپنے شوہر کو ایک بازاری عورت کے پنجہ سے رہا کرنے کے لئے جاتی ہے:—

"ایسی آواز سے جس سے ادائے وسنہرا ظاہر ہوتی ہے
اس نے (بازاری عورت نے) جواب دیا 'اپنے شوہر کو
مجھ سے چاہتی ہو گڑیا بی جان! آپ غلطی پر ہیں۔
میں نے کسی کے شوہر کو ضبط نہیں کر لیا!' وہ (بیوی)
اس جواب کی پہلے ہی سے متوقع تھی اس کے سنتے ہی
اس نے تار باندھ دیا: "آخر اس کی کیا ضرورت ہے

جھوٹ بولنے کی کوئی حاجت نہیں، میں تم سے یہاں لڑائی
لڑنے نہیں آئی ہوں، یقین مانو تم سے بیر رکھنے کا بھی
میں اپنے میں کوئی حق نہیں دیکھتی، میں جو آئی ہوں تو
اس لئے کہ اب بھی شاید تمہارے دل میں وہ چیز باقی ہو
جو ہم سب کا حصہ ہے۔ میں تمہیں نریا ہرٹ کا نہیں تریا ہوم کا
واسطہ دیتی ہوں؟ میں تم سے اپنا خاوند چھیننے نہیں
آئی کیونکہ اپنے میں اس کی نہ قابلیت اور نہ طاقت
باقی ہوں! میں اُسے مانگنے آئی ہوں تمھاری ہتھیلی میں
اس وقت ایک بڑی چیز ہے! اُسے چاہو مسل دو چاہے
چھوڑ دو! ان آنکھوں کو جو برسوں کے رونے سے تر
نہ رہی ہیں تم سکھا سکتی ہو! . . . . یہ جانتی ہو کہ
وہ اس وقت مجھ سے زیادہ تمہارا ہے مجھ سے بھاگ کر
تمھارے پاس آتا ہے حالانکہ وہ میرا شوہر ہے اُسے صرف
میرا ہو کر رہنا چاہیئے۔ میرے سوا اُس پر کسی کا حق نہیں
میرے سوا، وہ کسی کی ملکیت نہیں، کسی کی امانت نہیں،
تم عورت کے دل کی باتیں سمجھ سکتی ہو۔ سمجھتی ہو نا؟ ہائے
کہیں سمجھو! تم نے میرا شوہر لے کر مجھ سے کیا کیا لے لیا۔
گھر بھر کا امن گھر بھر کا چین لے لیا۔ وہ کل رات اور
بہت سی راتوں کی طرح یہاں تھا، اُس نے ساری رات

شاید کیا، یقیناً، تمھارے یہاں گزاری۔ شاید تم جو مجھ سے
ملنے اس کمرہ سے آئیں تو اُس کے پہلو سے اُٹھ کر آئیں! لیکن
جانتی ہو کہ اُس کی بیوی نے یہ رات کیونکر کاٹی؟ اس طرح کی
اور سینکڑوں راتیں کس طرح کاٹیں؟ جہنم کے انگاروں میں
لوٹ کر کاٹیں! میری پانچ برس کی ——— ہاں سنتی ہو؟
میرے پاس پانچ برس کی ایک ننھی بھولی جان بھی ہے
وہ بھی روتے روتے بابا کا انتظار کر کے سوئی ہے!

....

اُدھر وہ (بازاری عورت) کونے میں ایک مونڈھا کھینچ کر
اُس پر بیٹھ گئی اور پاؤں پر پاؤں رکھ اُسے ہلانا شروع کیا
اور ایک سنہری اور بے امان نظر سے نوجوان عورت کو
دیکھنے لگی "تو اب میں کیا کروں؟ کیا ہر شام بیگم صاحبہ کے
گھر اُن کے شوہر کو ہاتھ پکڑ کر پہنچا آیا کروں؟

اس گفتگو میں غصہ پیدا ہوتا ہے۔ بازاری عورت بیوی پر حملہ کرنے
اُٹھتی ہے:

"اُس پر حملہ کرنے کے لئے ایک قدم آگے ڈالا مگر صرف ایک
قدم، دوسرا قدم اُٹھانا چاہتی تھی کہ پیچھے سے فولادی
ہاتھوں نے اُس کے کندھوں کو پکڑ لیا.........."

یہ وہ گم کردہ راہ شوہر تھا جو کسی گوشہ میں کھڑا ان دونوں کی گفتگو

سُن رہا تھا ـــــــ اس تصویر خانہ کا آخری منظر فسانہ نگار اس طرح پیش کرتا ہے ـــــــ اور یہی منظر اُس کا وہ "پیام" ہے جسے وہ اس افسانہ کے ذریعہ سے پڑھنے والوں کے دلوں تک پہنچانا چاہتا ہے :-

اُس نے دیکھا کہ فاحشہ اُس کی بیوی پر ہاتھ چھوڑنا چاہتی ہے، یہ دیکھتے ہی دُنیا اُس کی آنکھوں میں تاریک ہوگئی۔ وہ بجلی کی تیزی کے ساتھ کوارٹھول کے کمرے میں در آیا اور اپنے آہنی پنجوں سے اُس کے کندھوں کو پکڑ کر جھنجوڑ دیا اور ایک جھٹکا دے کر اُسے اور اُس کے ساتھ اُس کی محبت کو اپنے سے دُور پھینک دیا اور پھر اپنی بیوی کے پاس جاکر اُس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور ایک نگاہ استرحام کے ساتھ جس میں آج کے دن تک کے تمام قصوروں کے لئے طلبِ عفو آکر جمع ہوگئی تھی اُس نے بھرآئی ہوئی آواز سے کہا :-

"میری خطاؤں کو معاف کر دو میں صرف تمہیں چاہتا ہوں میں صرف تمہارا ہوں اور تمہارا ہو کے رہوں گا۔"

اور پھر اُس کے چہرے کو جس پر دو آنسوؤں کے قطرے، دو قطرہ ہائے سعادت جھلک رہے تھے

اپنی طرف کھینچ کر اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے! "!
اور جب کہ فاختہ اپنے غصہ اور حسد کو ایک
کھسیانی ہنسی سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی اس
بیاہے جوڑے نے جن کے درمیان اب تک ایک
سرد مہری کی دیوار حایل تھی جسے وہ ہٹا نہ سکے تھے
پاک و صاف محبت بھرا بوسہ لیکر گویا دوسری مرتبہ
نکاح کیا اور وہ پیمانِ وفا باندھا جو اب عمر بھر تک
نہ ٹوٹیگا ——— یہ بوسہ اُس پیمانِ وفا کی مہر تھا!"

جس طرح اس افسانہ میں سجاد نے نہ صرف ہماری سطح کی ایک ناخوشگوار حقیقت کو اپنے قلم کے زور سے دل گداز بنایا ہے، بلکہ افسانہ کی روح میں ازدواج کے اخلاقی معیار کو سمو دیا ہے اس طرح "سُو دائے سنگین" میں اُنھوں نے حُسن و عشق کی آویزش کا ایک حزبیہ بہت موثر انداز میں پیش کر کے جذبات نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ اگر "خیالستان" میں اُنھوں نے انسانی زندگی کے رومان اور جنسی فلسفہ کی شعریت کو ایک ایسی سطح مرتفع پر نہ پہنچا دیا ہوتا جو اوسط درجہ کے اہلِ قلم کی دسترس سے باہر ہے تو میں اُن کے تمام افسانوں میں "سُو دائے سنگین" کے روحانی حزبیہ کو اُن کا سب سے بڑا شاہکار قرار دیتا۔ اس افسانہ کا اٹھان کچھ اس تدر بے تکان ہے کہ گویا اُس کا لکھنے والا "فرامرز" کا نام لیکر فی الاصل خود اپنے

وجودِ معنوی کی تصویر کھینچ رہا ہے۔ جو لوگ سجاد کی زندگی کے اندرون کی کوئی جھلک دیکھ چکے ہیں وہ دیکھیں کہ سودائے سنگین میں سجاد نے فرامرز کے وجودِ معنوی کا عکس جن نقش و نگار میں پیش کیا ہے اور اپنے اس افسانہ میں جو تصویر خانہ ترتیب دیا ہے وہ خود اُن کے وجدان اور اُن کی واردات سے کس قدر قریب ہے۔

اس طرح اپنے افسانہ کے ہیرو کا تعارف کراتے ہیں:۔

"فرامرز کو میں برسوں سے جانتا تھا۔ یہ ایک شاعر تھا۔ حساً و فکراً شاعر، اگرچہ لسانا نہ ہو ــــــ اپنی تمام ہیئتِ معنویہ کے ساتھ شاعر تھا کہ زندگی کو تورِ شعر میں دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ اُن بدبختوں میں سے تھا جو زندگی کی مادیات کے تھپیڑے کھانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں حال آنکہ اُن کا خستہ اور مجروح اور ہائے ستم! شاعرانہ دل مثل ایک مریض بچے کے اُن تھپیڑوں کے کھانے کی طاقت نہیں رکھتا ــــــ مگر اُس کی طبیعت میں ایک میلانِ نشو تھا کہ سب سے زیادہ مکدر زمانہ میں اپنے پُر ملال چہرے پر ایک مُسکراہٹ ضرور رکھتا تھا۔ اس تبسم سے میں یہ سمجھتا تھا کہ اُسے زندگی کی مادیات سے جب پالا پڑتا ہے تو وہ اُن کا یقین نہ کرنے میں ثابت قدم

رہنا چاہتا ہے اور اس طرح اپنے تئیں دھوکا دیا کرتا ہے۔
خود کہنا بھی یہی کرتا تھا:
"زندگی میں سے موسیقی اور شعر اور پھول اور رنگینی
اور پھر ان سب کا مجموعہ ان سب کا ماحصل عورت کو
نکال ڈالو، پھر دیکھیں تم کیونکر اس دُنیا میں زندہ
رہنے کی قوت اپنے اندر پاتے ہو؟ اگر زندگی ان ہی
چیزوں سے عبارت ہوئی اور اُن کی حقیقت بھی صرف
تخیل سے مرکب ہوئی تو ہم سب کتنے خوش قسمت
ہوتے! مگر یہ رنگین چیزیں ہوا میں رنگ بنکر اڑ جاتی ہیں،
غائب ہو جاتی ہیں ــــــــ اور یہ عورتیں!"
کتاب حیات کی اس جلد کو ایک جلد زراندود کی شکل میں
دُور ہی سے دیکھتا تھا۔ اُسے پڑھنے اُس کے باوں
اور صفحوں کو جو آنسووں سے لکھے گئے ہیں کھول کر دیکھنے کی
نوبت نہ آئی تھی۔ ابھی اُسے یہ حقیقت معلوم نہ ہوئی تھی کہ
زندگی میں شعر ایک نوحہ، ماتم، موسیقی، ایک فغان یاس،
پھول ایک منجمد قطرہ، گریہ رنگینی، ایک اُمید گریز؛
ان کے علاوہ اور کچھ نہیں ـــــــ اور ابھی اُس نے
یہ نہیں معلوم کیا تھا کہ عورت بھی اُسی سراب کے
مانند ہے کہ ڈھونڈو مگر نہیں ملتا، دکھائی دیتا معلوم

ہوتا ہے مگر ہاتھ نہیں آتا! ....''

فرامرز کے "سوداۓ سنگین" کا آخری منظر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ اپنے بے وفا محبوب کے مرمریں مجسمہ کے سامنے کھڑا ہے اور اپنے عشق و محبت کی گزری ہوئی داستان کے نقوش کو تخیل کی وسیع دنیا میں اس طرح اُجاگر کر رہا ہے:

"پھر تھی، ہاں تھی، اُس کرہ کو اپنے پاؤں تلے لڑھکاتی میرے پاس آئی اور آتے وقت اُس تاریکی میں لرزتی اور رقص میں بڑھتی جاتی تھی بجلی جو چمکی تو میں نے اُسے صاف اور واضح طور پر دیکھا۔ اُس نے باہیں میرے گلے میں ڈال دیں؛ تاروں کے ..... پیراہن اپنے چمکدار شگوفوں سے خون گرا رہا تھا کہ ہم ایک لمحہ میں ایک بوسۂ محبت کے ساتھ ساری عمر بسر کر گئے! ـــــ اب اس رات کے بعد ہر رات کی تاریکی میں وہ لرزتی اپنے کرہ کو لڑھکاتی لڑھکاتی اپنی عریاں باہیں میرے گلے میں ڈال دیتی ہے اور ایک لمحہ میں ـــــ اُس لمحہ میں جو عمر کے طول کے برابر ہوتا ہے ـــــ مجھے وہ لطفِ زندگی جو کسی عورت میں خاص کر اُس میں نہیں جس نے میرے ساتھ بے وفائی کی ـــــ"

کون کہہ سکتا ہے کہ سجاد نے بھی اپنی زندگی میں اس مجسمۂ مرمر کی طرح کسی ایسے ہی مجسمۂ مرمر کی خوابیدہ روح کو جاگتے نہ دیکھا ہو اکتنی راتوں کی

تاریکیون نے فرامرز کے اُس مجسمہ مرمر کی ٹھنڈی روح کو گرمایا ہوگا! کتنے ایسے بوسون کو جن مین سے ہر ایک کے ساتھ ایک پوری عمر بسر ہوگئی ہو سجاد نے دنیا کی تاریکی مین اُجالا کرتے دیکھا ہوگا! کیا اُنھون نے اپنے تصورات کی ناپید کنار وسعتون مین فرامرز کو اپنا مشیل یا اپنے کو فرامرز کا مشیل پایا؟ ——— اب وہ تمام وسعتین سمٹ کر ایک مشت خاک بن چکی ہین اور وہ مشتِ خاک ایک سربھر تودہ خاک کے اندر وہ سب کچھ سمیٹ کرلے گئی جو اُس کا تھا! سجاد کا ورثہ اب صرف یہ چند اوراق ہین ——— کچھ وہ کہ گویا ایک صحن چمن ہے جس مین پھول مسکرارہے ہین اور کچھ وہ کہ گویا کسی شہید کا خون آلود کفن ہے لالہ رنگ اور داغ دار! ——— بلکہ مین تو سجاد کے قلم کی گلکاریون مین موسم بہار کا ایک تختۂ چمن دیکھتا ہون کہ وہین مسکراتے ہوئے پھولوں کے ہجوم میں ایک خون آلودہ کفن کے ٹکڑے بھی بکھرے پڑے ہین! ——— مزاح اور طنز کی شوخیون مین بھی سجاد کی غمگین روح کا عکس موجود ہے اور یہی ان کی فطری شعریت کا کمال ہے!

سجاد کی شعرگوئی ان اوراق مین میرا موضوع نہین ہے تاہم جو کچھ اوپر کہہ چکا اُسی کی آئینہ دار اُن کی ایک نظم کے چند اشعار بھی پیش کئے دیتا ہون۔ اس نظم کا عنوان ہے "بلبل"۔ فرماتے ہین:

نہالِ گُل پہ جو تیرا مکان ہے اے بلبل
تو پھر یہ کس لئے شور و فغاں ہے اے بلبل؟
خروش جو ئے بہاری ہے یا ہے خندۂ گل
تو کس کے واسطے نالہ کناں ہے اے بلبل؟
عجب نہیں کہ جو یہ پوچھیں تجھ سے غنچہ دہن
بتا کہ کیا ترا دردِ نہاں ہے اے بلبل؟
کسی کو عشق کی تیرے خبر نہیں افسوس
مرا قلم ہی ترا ترجماں ہے اے بلبل؟

حقیقت یہ ہے کہ سجاد کی غمگین روح شکستِ آرزو کی ان طوفانی موجوں سے اپنے لئے موسیقی حاصل کرتی تھی، اُن کی کا آخا زدہ تھا کہ اگر خود علیگڈھ کے دارالعلوم نے جہاں اُن کی نوجوانی کا بہترین زمانہ گزرا اُن کی قدر کی ہوتی اور اُن کو ایک علمی اور ادبی فضا میں سکون قلب حاصل کرنے کا موقعہ دیا ہوتا تو خدا جانے وہ کتنے بے مثل ادبی شاہکار لکھتے۔ جن سے ہماری روحوں کے آتش خانے گرم ہوتے! لیکن ہرن کی پیٹھ پر گھانس لادی گئی اور سجاد کو دنیا نے ادب کی محفل کے بجائے "ڈپٹی کلکٹری" کی کچہری میں دیکھا! ۔ شعر و ادب کے اُن چند لمحوں کو جنھوں نے اُن کی زندگی میں راہ پائی وہ عمر بھر ایک جنازے کی طرح اپنے کاندھے پر لئے پھرے ـــــــ لوگ اُس جنازہ کے دوشالہ کی نقش کاری کو دیکھنے لگے ۔ یہ نہ دیکھا کہ اُس دوشالہ کے نیچے کوئی بہت پرانا

ناسور ہے! سجاد کی ادبی زندگی کا خون اُن لوگون کی گردن پر ہے
جنھون نے اس بہتے ہوئے چشمہ کا رُخ باغ کی کیاریون سے پھیر کر
مینڈکون کے اُس تالاب کی طرف بدل دیا جہان ایک چلو پانی پورا
سمندر سمجھا جاتا ہے! اس طرح سجاد مرنے سے پہلے ہی مرچکے تھے ——
مارے جاچکے تھے!

—————— · ——————

سجاد کی ادبیات مین اُن کا مخصوص اندازِ نگارش بہت نمایان ہے.
ترجمون مین بھی اور اُن کے طبعزاد افسانون مین بھی، غالب کی طرح
اُنھون نے بھی الفاظ کی نئی نئی ترکیبین ایجاد کین، ایک نیا اسلوبِ بیان
ایجاد کیا اور دو دو چار چار لفظون کے طبعزاد مرکبات مین قوتِ بیان کی
تمام شدت کو مرکوز کر دینے کا ایک نیا انداز اختیار کیا۔ اُن کے اس
"تجدد" کو جدید ترکی ادب سے بہت امداد ملی ہوگی لیکن اُردو زبان مین
اپنے بیان کی روانی کے ساتھ ساتھ بظاہر مشکل مرکبات کو اس طرح کھپا دینا کہ
وہ اُن کے بیان کی موسیقی سے ہم آہنگ ہو جائین اُن ہی کا کام تھا.
یہی اُن کی مخصوص انفرادیت تھی چند مثالین پیش کرتا ہون :۔

"چاہنے اور چاہے جانے کی ایک عمیق احتیاج میری
روح کو مضطرب کر رہی تھی"۔ "مین نے اپنی زندگی اپنی
عصمت اپنی تمام دُنیائے امید تمھارے قدمون پر
نثار کر دی تم نے اُنھین کیا کیا؟ اُن مین سے ہر ایک

ایک بڑی مکافات ایک بڑی بڑی قیمتون کی ارزش رکھی تھی۔
کہان ہے اُن کی مکافات؟"
"پلکون کو اس قدر سیاہ بناؤ کہ اُن مین سے تمھاری
نظر نکلے تو نورِ مخمور کی طرح نکلے۔" "وہ غصہ جو زفافِ عشق سے
پیدا ہوتا ہے .... وہ دل کے ایک کونہ مین دل کی
تاریکی سے صلح کر کے ملال کے ساتھ ترقی کرتا رہتا ہے۔" "ہر روح
اپنے مابقے نصف کو ہر خوب صورت چیز مین ڈھونڈتی ہے۔"
"ایسے آنسوؤن کے قطرے چاہے کیسی ہی شور و سنگلاخ
زمین پر گرین ضرور وہان ایک نہالِ شفقت اُگے گا۔"
ان مرکبات کا ایک سیلاب ہے جو سجاد کے بے تکان قلم سے بہ رہا ہے:۔
"ابتسامِ مسرت۔ خندۂ جگر۔ آہِ خسران۔ گردبادِ حیات۔
پرستیدۂ بیگانہ۔ صہبیت۔ اضطرابِ وجدانیہ۔ مجبوریہ سودائیتا۔
عصبی بحران۔ حُسنِ تضرع۔ دستِ تغلب۔ محاکماتِ فکریہ۔
حیاتِ ساعیانہ۔ بیت القسوہ۔ نسوۂ مستی۔ ادائے تسلمیت۔
مجیعۂ حیات۔ فاجحۂ طولانی۔ مضحکِ خونین۔ رابطۂ مناسبات۔
ضربۂ بے دوائی۔ نوازش کار۔ خندۂ صبا۔ سلسبیلِ قمر۔
صرصرِ رنگ و سحاب۔ عزمِ آہنین۔ حکمِ عدالت کی مہابت۔
طغیانِ غرور۔ قطرۂ سعادت۔ گردبادِ آہنگ و رنگ۔
ادیبِ شہیر۔ نغانِ یاس۔ امیدِ گریزان۔ ــــــــ"

غالب کی نظم کی طرح سجاد کی نثر نے ان مشکل اور گران تراکیب سے قدیم اسلوبِ بیان کا شیرازہ بکھیر کر پڑھنے والون کے ادراک کو ان مرکب الفاظ کی وسعتون اور گہرائیون کے قریب بلا یا۔ زبان کے نشو و نما کا یہ دَور اب گزر چکا ہے پھر بھی بلند پا یہ ادبیات مین خندۂ جگر۔ حُسنِ تضرع۔ ضربۂ بے وفائی رخندۂ ضیار۔ سلسبیل قہر۔ فغانِ یاس۔ امید گریزان اور گرد یادِ آہنگ و رنگ کی بلاغت اور عظمت کم نہین ہو سکتی ہے! ادبیات کے یہ "تاج محل" ہرروز تعمیر نہین ہوا کرتے! لیکن جب کبھی دیکھئے تو تعمیر معلوم ہوتے ہین ——— البتہ اب دُنیا کو ان "تاج محلون" کے بنانے کی فرصت نہین! تاہم باوجود اس کے کیا اُس قوتِ تعمیر اور اُس حُسنِ عمل کی عظمت کم ہو سکتی ہے جو "تاج محل" کے معمارون کو نصیب ہوئی تھی؟

سجاد ایک ترقی پسند ادیب تھے! ——— کیا یہ کوئی عجیب دعویٰ ہے؟ بلا شبہ ترقی پسندی کے صحیح مفہوم کے اندر سجاد کا اندازِ نگارش "ترقی پسند" تھا اُنھون نے اُردو ادب کو ترکی ادب کے ترقی پسند رجحانات سے متاثر کر کے قدامت کی زنجیرین توڑ دین ——— نہ صرف انشا پردازی کے اعتبار سے بلکہ مطالب کے اعتبار سے بھی اُنھون نے اپنے پڑھنے والون کو ترقی پسندی کا پیام دیا۔ اُن کے افسانون کے تمام موضوعات بھی ایسے ہی ہین اور خود اُردو زبان کے

متعلق بھی اُن کے خیالات نے قدامت پسندی کی حدود کو توڑ دیا تھا۔
زبان کی ترقی اور تہذیب کے متعلق وہ قدیم راستوں سے ہٹ کر آگے
بڑھنا چاہتے تھے اور یہ رجحان اُس خطبۂ صدارت میں بھی پوری طرح
ظاہر ہوتا ہے جو اُنھوں نے ہندوستانی اکیڈمی کی چھٹی کانفرنس میں
پڑھا تھا۔ اس خطبہ میں اُردو زبان کی ترقی کے وسایل سے بحث
کرتے ہوئے اُنھوں نے طباعت کے مسئلہ پر کہا تھا کہ :—

"جب تک آپ لیتھو کے شکنجے سے اپنے اخبارات اور
اپنی کتابوں کو آزاد نہ کرینگے میری رائے میں اُردو پوری ترقی
نہیں کر سکتی .... سوائے ہندوستان کے
اور ہندوستان میں بھی سوائے اُردو کے کہیں اخبار اور
کتابیں لیتھو میں نہیں چھاپی جاتیں۔ ایران، مصر، ترکی،
عربستان اور تو اور افغانستان اور حجاز بھی اُن
تمام ممالک میں لیتھو کی چھپائی یک قلم موقوف کر دی گئی
.... ہمارا ہندوستان۔ میں نے غلط کہا،
ہماری اُردو، ابھی تک "پتھر کے زمانہ" میں ہے۔
اس سے آگے نہیں بڑھی!"

اُنھوں نے اپنے اس خطبہ کا بڑا حصہ "ٹائپ کی اس بحث کے لئے
وقف کیا تھا، اور پھر اس بحث کو یہاں تک پہنچایا تھا کہ اُردو زبان
کے لئے رومن رسم الخط اختیار کر لینے کی تحریک پر زور دیتے ہوئے

کہا تھا کہ :-

''ایک اور خیال میں نے بار بار آپ کے سامنے پیش کیا ہے .... اب پھر آپ کو بھکانے اور آپ کے درد سر کا باعث ہونے کے لئے میں اسی راگ کو الاپتا ہوں لیکن اس مرتبہ میری ہمت بڑھی ہوئی ہے .... نہایت مختصر طور سے عرض کر دوں کہ میں یہ نہیں کہتا کہ ترکی کی طرح فا لونا ہندوستان کا فارسی حروف یا ناگری حروف میں لکھنا بند کر دیا جائے اور ہر شخص مجبور کیا جائے کہ وہ رومن میں لکھے پڑھے، نہیں، میری غرض یہ ہے کہ موجودہ فارسی خط اور ناگری خط جاری رہے مگر ساتھ ہی اس کے رومن کو بھی رواج دینے کی کوشش کی جائے۔''

اس مسئلہ پر مرحوم کی مفصل رائے ایک ضمیمہ کی صورت میں اُن کے خطبہ کے ساتھ ہی اکیڈمی کے رسالہ کی اپریل ۳۸ءکی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔ قطع نظر اس امر کے کہ یہ تجویز کہاں تک صحیح یا غلط یا قابلِ عمل یا نا قابلِ عمل ہے۔ سجاد مرحوم کے ان رجحانات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اُردو ادب کو ایک بین الاقوامی حیثیت میں دیکھنے کے کس قدر خواہشمند تھے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ٹیگور کے بعد سجاد ہی نے سب سے زیادہ اپنے ادب کو باہر کے (خصوصاً

ترکی ادب کے) اثرات سے متاثر کیا۔ اُن کے زمانہ کا ترکی ادب "جدید ادب" تھا۔ وہ ادب تھا جو ترکوں کو نئی زندگی کے دروازہ تک لایا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ جو نسبت ۱۹ ویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں ترکی ادب کو اُس کے عہدِ جدید سے حاصل ہوئی وہی نسبت سجاد کی ادبیات کو کس قدر کم درجہ میں ہندوستان کے دورِ جدید سے حاصل ہے ——— کم درجہ میں اس لئے کہ مرحوم اپنی زندگی کا بہت ہی مختصر زمانہ نئے ادب کی تعمیر میں صرف کر سکے۔ بہرحال جو کچھ وراثت وہ اپنی زبان کے لئے چھوڑ گئے اُس کی قدر و قیمت سے انکار کرنا ناحق شناسی کا بدترین گناہ ہوگا۔ اُردو زبان ایک زندہ زبان ہے اُس کی باعمل روح سے یلدرم کی روح ہمیشہ بغل گیر رہے گی اور یہ ناممکن ہے کہ ہم اُردو ادب کی ترقیوں کا ذکر کریں اور سجاد کو بھول جائیں!

وہ آخری ملاقات مجھے یاد آتی ہے۔ ایک دن کہنے لگے "کیوں بھائی یہ کیا بات ہے کہ اُردو زبان کے لئے اب کوئی دوسرا پریم چند پیدا نہیں ہوتا؟" میں نے کہا "کوئی پریم چند ہو یا اقبال ہو یا ٹیگور ہو یہ نوع تو صرف ایک ہی پیدا ہوا کرتی ہے! قدرت شاہکاروں کے پیدا کرنے میں کبھی بھی فیاض نہ تھی!" ——— ایک غمگین اور تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگے: "اے کاش .... اور

"اے کاش" کہہ کر رک گئے! ـــــ میں جانتا تھا کہ اس کے بعد وہ کیا کہتے!
اس لئے گفتگو کا رُخ بدل دیا۔

۔ بہر حال میرے پاس سجاد کی آخری یادگار اُن کی وہی غمگین اور تھکی ہوئی مسکراہٹ ہے جو اُس دن شام کو اُن کے ہونٹوں پر میں نے دیکھی تھی! آج جب میں اُن کے متعلق یہ چند اوراق لکھنے بیٹھا اور مجھے وہ آخری ملاقات یاد آئی تو اُن کے افکار کا آئینہ بنکر اُن کے وہی فلسفیانہ الفاظ پھر مجھے یاد آئے جو اُنھوں نے "سیل زمانہ" کو مخاطب کر کے لکھے تھے:۔

"بہے جا!۔ بہائے جا! نہ تجھ میں سلامتی نہ تیرے کنارے سلامتی! مٹے ہوؤں کے نشان مٹائے جا!۔ تیراکوں کو ڈبا، غواصوں کو غرق کر۔ یہی تیرا کام ہے....
بہتر یہی ہے کہ لاتعداد خس و خاشاک کی طرح جو مجھ سے پہلے آئے اور بعد میں آئیں گے، بہے جاؤں!......
بس اے سیل زمانہ بہے جا! بہائے لئے جا! اُس بحرِ ناپیدا کنار میں اُس عمّان عظیم الشان میں، اُس اوقیانوس ابد میں، اب یا جب، تیرا دل چاہے مجھے گرا دے!!"

سر سید رضا علی

سجاد حیدر یلدرم مرحوم

سجاد حیدر کی قبر پر عقیدت اور محبت کے دو پھول رضا علی کی طرف سے

مونس ہے بعدِ مرگ کسی کا جہاں میں کون
دو پھول بھی لحد پہ کوئی دھر نہ جائے گا

سر سید احمد خان علیہ الرحمۃ کی اس اصلاحی تحریک کو جس نے ۱۸۷۵ء میں شہر کویل میں درسگاہ کی صورت اختیار کی میں اپنے نزدیک سلطنت مغلیہ کے خاتمہ کے بعد مسلمانانِ ہند کا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتا ہوں علی گڈھ کی زندگی کا پہلا دور ۱۸۷۵ء میں شروع ہوکر ۱۸۹۵ء میں ختم ہوا۔ اسی طرح دوسرے اور تیسرے دور کا آخری سال ۱۹۱۵ء اور ۱۹۳۵ء کو سمجھنا چاہیے۔ چوتھا دور نصف کے قریب گذر چکا ہے۔ قرینہ یہ ہے کہ ۱۹۵۵ء تک کم و بیش صحیح اندازہ ہوسکے گا کہ

ہمارے ملک میں تعلیم کو سیاست سے کیا مناسبت ہے اور اگر کسی خدا کے بندے کو علی گڈھ کی سچی تاریخ لکھنے کی توفیق اس وقت مل پڑی تو معلوم ہو جائے گا کہ تنہا تعلیم کے دائرہ میں ہی نہیں بلکہ طلب حق، خداشناسی اور خداپرستی۔ عالی حوصلگی اور رواداری کے لیے آب و گیاہ لق و دق بیابانوں۔ معاشرتی اصلاح کی نظر فریب وادیوں اور سیاسی مسلک کے طلسمی کارخانوں میں جو منزلیں مسلم علی گڈھ نے طے کی ہیں ان سے وہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں یا ان کے پورے ہونے کی امید ہو سکتی ہے جو سر سید احمد خاں مرحوم اور ان کے رفیقوں نے تحریک علی گڈھ کو عملی جامہ پہنانے وقت قائم کی تھیں۔

سجاد حیدر کی موت اس دردناک حقیقت کو یاد دلاتی ہے کہ علی گڈھ میں علمی مذاق کی قدر کبھی نہیں ہوئی ادبی مذاق پیدا کرنے یا طلبا کا علمی ذوق بڑھانے یا ان کی ہمت بندھانے کا خیال علی گڈھ کے پہلے دور میں نہ اساتذہ کو تھا نہ ٹرسٹیوں کو۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم دورِ اول کے بہترین علمی اور ادبی مذاق رکھنے والے طالب علم تھے ہم عصر ان دونوں صاحبوں کی بڑی قدر کرتے تھے مگر کالج کے اربابِ حل و عقد کی آنکھوں میں ہمیشہ کھٹکتے ہی رہے۔ دوسرے دور کے طلبا میں سجاد حیدر کا مرتبہ بلحاظ علمی قابلیت کے بہت بلند تھا، اردو اور

انگریزی بہت اچھی لکھتے اور بولتے تھے۔ انشا پردازی کی شہری لڑیوں میں موقع محل سے ہمیشہ لطافت اور بذلہ سنجی کے موتی پروتے تھے، مطالعہ کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ہماری قومی زندگی میں جن نئے خیالات کو مفید سمجھتے تھے ان کی زبردست تائید تحریر اور تقریر کے ذریعے سے کرتے تھے۔ رواداری کا یہ عالم تھا کہ دوسروں کی بات سننے اور اس پر عمل کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ بڑے خوش خلق اور سادہ مزاج تھے تعلیم نسواں کے بڑے زبردست حامی تھے کھیل کود سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے جس کی غالباً سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسٹر بیک کے چہیتے طلبا سب کھلاڑی تھے جن کو علمی مذاق سے کچھ سروکار نہ تھا کھیل کود کے ذریعے سے جسم کی تربیت نہایت ضروری چیز ہے لیکن کھیل کود ذریعہ ہے ایک مقصد حاصل کرنے کا۔ اصلی مقصد دماغ کا صحیح نشو و نما اور اس کی تربیت اور صحت کو اچھی حالت میں رکھنا ہے جس کے حاصل کرنے کا کھیل کود، ورزش، کسرت ایک ذریعہ ہے۔ اصل مقصد کو چھوڑ کر ذریعہ کو بجائے خود مقصد بنا لینا بالکل غلط طریقہ ہے مگر یہ طریقہ میرے زمانہ میں علی گڈھ کی مقدس روایات میں داخل تھا۔ مسٹر بیک کی زبردست شخصیت نے اس مذموم طریقہ کے پھیلاؤ کو یہاں تک پہنچا دیا کہ اس زمانہ میں ذوقِ ادب اور کھیل کود کی قدر و قیمت کا اپنی اپنی جگہ جائزہ لینے کے بحث پر مولانا شوکت علی مرحوم نے

لاہور کے اسلامی اخبار پنجاب آبزرور میں جو انگریزی نکلتا تھا ایک مضمون لکھا تو بجائے نام لکھنے کے اپنا ادبی لقب بڑے فخر سے "مسٹنڈا وحشی" مضمون کے آخر میں درج کیا۔ کھلاڑی طلبا کی اس بے جا قدر و منزلت کا یہ نتیجہ ہوا کہ علمی اور ادبی ذوق رکھنے والے طالب علموں کی بے تعلقی کھیل کود اور ورزش اور کسرت سے بڑھتی گئی اور رفتہ رفتہ وہ کرکٹ کی گیند کو ہاتھ لگانا یا فٹ بال کو پابوسی کا موقع دینا اپنے لئے باعث توہین سمجھنے لگے۔ صدیوں کی تعلیم و تربیت نے مغربی ممالک میں ان قابلیتوں کی تربیت کی حدود مقرر کردی ہیں جن کا تعلق جسمانی اور دماغی نشو و نما سے ہے۔ ہمارے ملک نے اس معاملہ میں ابھی کافی تجربہ حاصل نہیں کیا ہے اور میری ناچیز رائے میں نہایت ضروری ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے ارباب بست و کشاد دماغ کو دماغ اور جسم کو جسم سمجھیں اور اس پالیسی کو تہ دہرائیں جس نے اب سے چالیس پچاس برس پہلے طلبا کے ذوق علم و ادب پر کرکٹ کے بیٹ کا پردہ ڈال رکھا تھا۔

میری پہلی ملاقات سجاد حیدر یلدرم مرحوم سے جولائی سنہ ۱۸۹۸ء میں ہوئی تھی۔ محمد حیات خان، مشتاق احمد زاہدی اور حیدر حسن مرحوم بھی اس زمانے کے علمی ذوق رکھنے والے طلبا میں سے تھے۔ بی اے پاس کرنے کے بعد مشتاق احمد نے علیگڈھ چھوڑ دیا۔ مگر دوستوں سے ملنے کے لئے اکثر علیگڈھ آتے تھے۔ یہ سب حضرات علیگڈھ کی زندگی کے

گھرے نقاد تھے۔ علی گڈھ مین اس وقت تک کوئی ایسا انتظام نہ تھا کہ اگر کوئی ہونہار طالب علم کسی خاص مضمون مین کمزور ہوتا تو اس کمزور مضمون کی طرف اساتذہ خاص توجہ کرتے۔ سجاد حیدر مرحوم ریاضی سے گھبراتے تھے اور اسی وجہ سے ایف۔ اے کے امتحان مین در مقصود کی تلاش مین ایک سے زیادہ مرتبہ غوطے لگانے پڑے۔ میرے نزدیک ایسے ہونہار طالب علمون کو جنھین کسی خاص درسی مضمون سے مناسبت نہ ہو ان کے حال پر چھوڑ دینا بڑی غلطی ہے۔ اسلامی درسگاہون اور بالخصوص مسلم یونیورسٹی کا اہم فرض ہے کہ ہونہار طالب علمون کی تعلیم کا اس مضمون مین جس سے انھین خاص مناسبت نہ ہو مناسب انتظام کرے تاکہ ان کی عمر کے ایک یا دو عزیز سال رائیگان نہ جائین۔

سر سید احمد خان علیہ الرحمتہ کے اکثر دوست نہ صرف روشن خیال اور ضرورت زمانہ کے پہچاننے والے تھے بلکہ علم و فضل مین بھی ان کا درجہ بلند تھا۔ نواب حاجی اسمٰعیل خان صاحب رئیس دتاولی سید صاحب کے بڑے مخلص دوست تھے۔ نواب صاحب عربی اور فارسی مین ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اردو کے بہت اچھے ادیب اور صاحب تصنیف تھے۔ ان کو پولٹیکل معاملات سے بھی گہری دلچسپی تھی اور تین سال تک بذریعۂ نامزدگی ہمارے صوبہ کی کونسل کے ممبر رہ چکے تھے۔ سنہ ۱۸۹۲ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی بہ موجب میونسپلیٹون اور ڈسٹرکٹ بورڈون کو یہ حق دیا گیا تھا کہ صوبہ کی

کونسل میں بعض جگہوں کو بذریعہ انتخاب پُر کر سکیں۔ مگر رائے دہندوں کا
جو اکثر ہندو تھے کسی مسلمان کو منتخب کرنا ایسا ہی بعید از فہم تھا
جیسا مسٹر چرچل یا مسٹر ایمری کا کسی ہندوستانی کو صوبہ کا گورنر مقرر
کرنا یا پولینڈ والوں کا روس کی انصاف پسندی اور راست بازی کی
داد دینا یا جاپانیوں کا دنیا کو یہ یقین دلانا کہ وہ چین کے سچے دوست ہیں
اور چین کو مضبوط بنانے اور اہلِ یورپ سے اس کا پنڈ چھڑا لینے کے لئے
بادلِ ناخواستہ چین سے جنگ کر رہے ہیں۔ نواب اسمٰعیل خاں صاحب
اس زمانہ میں علی گڑھ سے ایک ماہانہ رسالہ نکالتے تھے جس کا نام معارف تھا
ملک کے مشہور ادیب اس رسالے میں مضامین لکھتے تھے ان کا معیار بھی
بہت بلند ہوتا تھا۔ سجاد حیدر مرحوم نواب صاحب کے سکرٹری تھے
اور رسالۂ معارف کے ایڈیٹر مولوی وحید الدین سلیم۔ مولوی صاحب
اور مولانا محمد علی نے سب سے پہلے اُردو داں اخبار بین حضرات کو
سیاسی مسائل کے سادہ دسترخوان پر ادب کی چاشنی سے لذت آشنا
کیا۔ سجاد حیدر معارف میں خود بھی مضمون لکھتے تھے اور معارف کے لئے
انگریزی رسالوں کے اچھے مضامین کا اُردو میں ترجمہ بھی کرتے تھے مرحوم اس خدمت پر
کئی سال تک مامور رہے۔ مغربی ممالک کا موجودہ نظریہ تو یہ ہے کہ ہر ذہین
اور طباع آدمی جس کام پر توجہ کرے اس میں پوری مہارت حاصل
کر سکتا ہے۔ ممکن ہے یہ نظریہ تمام تر صحیح ہو یا تمام تر غلط لیکن اس میں
شبہ نہیں کہ بعض طبیعتوں میں کام کرنے کی فطری قابلیت موجود ہوتی ہے۔

سجاد حیدر کی طبیعت کا رجحان علم و ادب کی طرف تھا لیکن آج سے چالیس برس پہلے ہندوستانی اس قابل نہیں سمجھے جاتے تھے کہ کوئی یونیورسٹی انہیں فارسی عربی یا سنسکرت یا ریاضی کی تعلیم دینے کے سوا کسی اور مضمون کے پڑھانے کی خدمت ان کی سپرد کر سکے۔ کالجوں میں ریاضی پڑھانے کی خدمت ہندوستانیوں کی سپرد اس لئے ہونے لگی تھی کہ بنگالیوں نے ثابت کر دیا تھا کہ ریاضی پڑھانے کی قابلیت ان میں انگریزوں سے کم نہیں ہے۔ پی۔ گھوش کی ارتھمیٹک (علم حساب کی کتاب) اس زمانے کی مشہور تصنیف تھی۔ بابو جادب چندر چکرورتی نے بھی جو علی گڈھ میں ریاضی کے پروفیسر تھے ایک بہت اچھی ارتھمیٹک لکھی تھی جو ہمارے صوبہ کی اکثر درسگاہوں میں بجائے پی۔ گھوش کی کتاب کے استعمال کی جاتی تھی لیکن ہمارا صوبہ تعلیم کے معاملہ میں اس قدر پسماندہ تھا کہ انگریزی ادب کے علاوہ بھی اکثر و بیشتر مضامین کے پروفیسر انگریز ہوتے تھے۔ میری ناچیز رائے میں اگر سجاد حیدر مرحوم بی۔ اے پاس کرنے کے بعد علی گڈھ کالج میں انگریزی زبان کے جونیر لکچرر مقرر کر دئے جاتے تو انگریزی ادب کی دنیا میں کافی شہرت حاصل کرنے کا موقع ان کو مل جاتا۔ اردو تعریب اس زمانہ میں اس قابل نہ سمجھی جاتی تھی کہ کسی یونیورسٹی یا کالج کے احاطہ میں اسے باریابی کا شرف حاصل ہو سکے۔ سجاد مرحوم کے سپرد اگر فارسی پڑھانے کی خدمت کر دی جاتی تو لکیر کے نقیر ہونے کی بجائے ان کی جدت پسند طبیعت

بیسویں صدی عیسوی کے ایرانی چمن کے گل بوٹے اہلِ وطن کے سامنے اس خوبی سے پیش کر سکتی کہ فارسی زبان و ادب کے خوش تمانجتے ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں نئی امنگیں پیدا کرتے۔ نواب اسمٰعیل خان اور ان کے علم دوست اصحاب کی صحبت اور رسالہ معارف سے عملاً سب ایڈیٹری کا تعلق ہونے کے باعث سجاد حیدر مرحوم کو بہت فائدہ ہوا۔ یہ افسوس ضرور ہے کہ سرکاری ملازمت کی قیود و شرائط کے باعث مرحوم کی طبیعت کے جوہر پورے طور پر نہ کھلنے پائے۔ بھلا غور کیجئے جب سجاد جیسے آزاد منش اور شگفتہ مزاج آدمی کو چھ سات گھنٹے روزانہ کچہری میں بیٹھ کر مال کے مقدمات میں کھتونی اور خسرہ کے اندراجات کو پٹواری کے اس بیان سے مطابق کرنا پڑے جو اندراجات مذکورہ کے بالکل متضاد ہو اور جب بہ حیثیت مجسٹریٹ ضرب شدید کے مقدمہ میں ملزم کے ایک درجن معزز گواہانِ صفائی کی شہادت قلم بند کرنا پڑے کہ جس وقت مارپیٹ کا ہونا بیان کیا جاتا ہے ٹھیک اس وقت ملزم کسی شادی میں شریک یا دعوتِ کہنسا میں موجود تھا تو طبیعت کی شگفتگی کیا خاک قائم رہ سکتی ہے سجاد حیدر نے بہت سے تجربے حاصل کئے۔ ممالک متوسط کے ایک بڑے رئیس کے اتالیق رہے۔ سردار یعقوب خان صاحب کے عرصہ تک اسسٹنٹ پولٹیکل آفیسر اور پولٹیکل آفیسر رہے۔ سر محمد علی محمد خان مرحوم مہاراجہ محمود آباد کے پرائیویٹ سکرٹری کی خدمات انجام دیں۔ ڈپٹی کلکٹر رہے بہت ممکن ہے کہ

مہتمم خزانہ کے وہ فرائض بھی انجام دیئے ہوں جو دو برس کے عرصہ میں آدمی کو انسان سے مشین بنا ڈالتے ہیں۔ سیر و سیاحت کی علمی و ادبی شغف جاری رکھا۔ پنشن لی۔ اور پھر شکوہ آباد پہنچ گئے جب زندگی میں اپنے مرحلے پیش آئیں اور دنیا کے جھگڑے چین نہ لینے دیں تو بڑے سے بڑے ہنسوڑ آدمی کی طبیعت بھی مرجھا جائے گی۔

سجاد حیدر رسوم و قیود کے پابند نہ تھے بلکہ وہ ایسے رسم و رواج کی اصلاح کرنا چاہتے تھے جس سے سوسائٹی کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ شادی کے معاملہ میں انھوں نے بڑی ہمت مردانہ سے کام لیا اور ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ خاتون سے جو ایک شیعہ خاندان میں پیدا ہوئیں اور خود بھی شیعہ ہیں شادی کی۔ بنت نذر الباقر صاحبہ (بیگم سجاد حیدر) مراد آباد کے ایک معزز سید خاندان کی بیٹی ہیں۔ ان کے والد نے ان کو بہت اچھی تعلیم دلائی اور آج سے تیس برس پہلے ہندوستانی اصلاحی تحریک کی صف اوّل کی ناز کام کرنے والیوں میں تھیں۔ رواداری عجیب نعمت ہے۔ سجاد حیدر سُنی تھے اور بی بی شیعہ مگر دونوں نہایت خوش و خرم اور فرقہ وارانہ اختلاف کی پراگندگی سے محفوظ و مامون رہے۔ سجاد حیدر اور بیگم سجاد حیدر نے اپنی اولاد کو بھی جو نہایت سعید ہے۔ بہت اچھی تعلیم دلائی۔ یلدرم نہٹور ضلع بجنور میں پیدا ہوئے تھے ان کے والد پولیس کے انسپکٹر اور آخیر زمانہ میں بنارس کے کوتوال تھے، اس زمانہ میں لکھنؤ، بنارس، الہ آباد، آگرہ،

بریلی اور میرٹھ کی کوتوالی محکمۂ پولیس مین سب سے بڑا عہدہ تھا جو ہندوستانیون کو مل سکتا تھا۔ پدر مرحوم کے دو چھوٹے بھائی ہین ان دونون نے بھی علی گڈھ مین تعلیم پائی نصیر الدین حیدر علی گڈھ مین میرے ہم جماعت تھے۔ ڈپٹی کلکٹری سے پنشن لینے کے بعد اب تین چار سال سے ریاست ٹونک مین ریونیو منسٹر (وزیر مال) ہین۔ خان بہادر ڈاکٹر حیدر الدین حیدر رسول سرجن تھے وہ بھی اب غالباً پنشن لے چکے ہین۔

مرحوم کی طبیعت مین بلا کی شوخی تھی۔ یون تو تصنیف و تالیف کا سلسلہ کم و بیش زندگی بھر قائم رہا مگر طالب علمی کے زمانے مین جو نظمین اور مضامین انھون نے لکھے ہین وہ بڑے پُر لطف ہین اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مرحوم کو زمانہ چین سے بیٹھنے دیتا تو وہ ملک و قوم کی عظیم الشان ادبی خدمت انجام دیتے۔ مرزا پھویا چھوٹی سی نظم ہے جو سجاد نے سنہ ۱۹ء مین لکھی۔ مرحوم نے اس نظم مین ایک سچی کہانی بیان کی ہے۔ کہانی یہ ہے کہ سر سید احمد خان کی وفات کے بعد علی گڈھ کالج کی امداد کے لئے سر سید میموریل فنڈ قائم کیا گیا۔ محسن الملک نے ملک کا دورہ کیا اور بہت سے شہرون مین جلسے کرکے تقریرین کین اور تقریرون مین بتایا کہ قوم کا فرض ہے کہ اپنے کالج کی مالی امداد کرے اور مسلمان لڑکون کو تعلیم کے لیے علی گڈھ بھیجے۔ مرزا پھویا لکھنؤ کے ایک تعلقدار کے اکلوتے بیٹے تھے۔ مرزا کی عمر

بیس سال کی تھی۔ بڑے ناز و نعمت سے پلے تھے اور گھر سے باہر نکلنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ محسن الملک کی سحر بیانی کا یہ اثر ہوا کہ مرزا کے باپ نے مرزا کو علی گڑھ بھیجنے کا تہیّہ کر لیا۔ یہاں نظم کے کچھ شعر سُنئے ؎

اس ارادہ کو جب کہا گھر میں — پڑ گیا رونا پیٹنا گھر میں

چیخی مرزا کی ماں کہ ہائے ہائے — کوئی جا کر ذرا انھیں سمجھائے

میرا بچہ نہ جائے گا کومل — میرا پتھر کا تو نہیں ہے دل

باپ نے ایک نہ سُنی اور مرزا کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ وداعی منظر ملاحظہ کیجئے ؎

خالا، ماں، ممانی، بھابی جان — اپنے مرزا پہ سب ہوئیں قربان

آپا جانی نے بھی بلائیں لیں — سب نے مل مل کے یوں دعائیں دیں

یا الٰہی یہ خیریت سے پھرے — اور دشمن پہ اس کی بجلی گرے

واسطہ مرتضٰی علیؑ کا تجھے — جلد لا کر ملائیو ہم سے

مرزا علی گڑھ پہنچے۔ نئی دُنیا نظر آئی ہکّا بکّا ہیں کسی سے کچھ نہیں کہتے۔ ہفتہ بھر تک علی گڑھ کے طور طریق دیکھے اس کے بعد قبلہ و کعبہ کی خدمت میں عریضہ لکھا۔ اب علی گڑھ کے حالات مرزا کی زبان سے سُنئے ؎

یاں کے لڑکوں کا حال ہی ہے جُدا — ایسا دیکھا کبھی، کبھی نہ سُنا

جنس ہر اک نئی دکان نئی — اور تو اور ہے زبان نئی

ایک دال ایک گوشت کہتے ہیں — جانیں کس دیس میں یہ رہتے ہیں

ہوں پریشان تو آ لیا فرمائیں! — خوش ہوں گر تو ہیر پھیر پہ سُنائیں

گر ہو اچھا لباس ٹھاٹ کہیں — اور گنواروں کو راج گھاٹ کہیں

جو تنعم کی ہو ذرا سی بھی — اس کو کہتے ہیں یاں پہ عیاشی

عمدہ کھانا کھلانا عیاشی — عمدہ شربت پلانا عیاشی

علی گڑھ کی منظم زندگی کی تصویر لکھنؤ کے رئیس زادے کی عینک لگا کر دیکھئے ؎

صبح لڑکے ڈرل کراتے ہیں — ایسے بے رحم ہیں تھکاتے ہیں

حکم ہے وقت ہی پہ کھانا کھاؤ — شام کو ایک جگہ جمع ہو جاؤ

بھوک ہو یا نہ ہو نہیں پروا — ہے اسی وقت ٹھونسنا پڑتا

طلباء کو بغیر اجازت حاصل کئے شہر جانے کی ممانعت تھی مرزا اس کی شکایت کرتے ہیں ؎

یاں کی آزادی ہے بہت محدود — شہر جانا بھی ہو گیا مسدود

اس لئے عرض ہے کہ یہ چیزیں — لکھنؤ سے روانہ آپ کریں

ایک ڈبیہ دیا سلائی کی — بوتل یہ اک نیلی روشنائی کی

اک برش جوتہ صاف کرنے کا — اور برا ل کو بھی ساتھ تھوڑا سا

بوٹ کے لیس کی ضرورت ہے — اور مزے بھی چند اچھے سے

دو گھڑے اک صراحی پیالے چار — اور ممکن ہو گر تو تھوڑا اچار

اور باقی تو خیریت ہے سب — سب کو تسلیم زیادہ حد ادب

ممکن ہے کہ زبان پر دلی اور لکھنؤ کے ناقدانِ سخن اعتراض کریں لیکن دو باتیں ملحوظِ خاطر رہیں ۔ ایک تو یہ کہ یہ کلام سجاد حیدر کے لڑکپن کا ہے ۔ دوسرے یہ کہ جس زبان میں یہ نظم لکھی گئی ہے اس کا تعلق دلی اور لکھنؤ سے ہو یا نہ ہو

مگر یہ وہ زبان ہے جو اب سے چالیس پینتالیس برس پہلے علی گڈھ کالج کی ٹکسالی زبان تھی۔ میں نے قصداً بعض ایسے شعر منتخب کئے ہیں جن میں علی گڈھ کے مخصوص محاورے زبانِ حال سے بتلا رہے ہیں کہ ہم نہ دلی کے مرید ہیں نہ لکھنؤ کے چیلے۔ ہم تو اس وسیع اور تر و تازہ چمنِ اُردو کے نئے پودوں کے رنگین پھول ہیں جو سر زمین کول پر اُگے تھے۔ یہ رنگ و بو آپ کہیں اور نہ پاپئے گا ان پھولوں کو دیکھنے اور خوش بو سونگھنے کے لئے آپ کو کول ہی آنا پڑے گا۔ رسالہ مخزن میں جو مضامین یلدرم نے لکھے تھے وہ بھی زبان کی خوبی اور خیالات کی جدّت کے لحاظ سے بڑے پُر لطف تھے اور آج بھی ہمارے نوجوان ان کے مطالعہ سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

یلدرم مرحوم ترک قوم اور ترکی زبان کے بڑے والہ و شیفتہ تھے۔ ترکی زبان علی گڈھ میں ہی پڑھنا شروع کر دی تھی۔ ترکی اخبارات بھی منگاتے تھے اور ترکی زبان کی جب کوئی مخصوص طرز ادا پسند آتی تھی تو بہت خوش ہوتے تھے اور دوستوں سے اس کا تذکرہ کرتے تھے۔ میں ترکی زبان سے نا واقف ہوں اس لئے ترکی زبان کی وسعت اور دل آویزی کے بارے میں میرا کچھ کہنا قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ اتنا ضرور مجھے معلوم ہے کہ ترکی کا اپنا ذاتی سرمایہ بہت محدود و مختصر ہے۔ ترکی زبان کا کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جس کا مقابلہ میر یا سودا۔ ناسخ یا آتش۔ غالب یا انیس سے کیا جا سکے۔

عربی شعراء سے مقابلہ کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترکی مدارس میں
بیس سال پہلے تک فارسی شعراء کا کلام پڑھایا جاتا تھا اور فارسی شعراء کو ہی
ترک اپنا قومی شاعر سمجھتے تھے۔ گذشتہ بیس برس میں جب سے اتاترک
مصطفےٰ کمال نے لاطینی رسم الخط جاری کیا ہے ٹرکی میں یہ رواج شروع
ہوا ہے کہ قومی نظمیں ترکی زبان میں کہی جائیں مگر ہنوز دلّی دُور والا
مضمون ہے۔ یلدرم پکّے قوم پرست تھے اور انیسویں صدی عیسوی کے
آخر میں اسلام کی بے بسی کا جو عالم تھا اس کے لحاظ سے وہ چاہتے تھے کہ
تمام دُنیائے اسلام ترکی کی برتری تسلیم کرے اور ترکی کی رہنمائی میں
سارے اسلامی ممالک بالخصوص ہندی مسلمان مغربی علوم وفنون سے
اپنی اپنی ضرورت کے بقدر مستفید ہو سکیں۔ مرحوم غالباً دو مرتبہ
ترکی گئے تھے۔

سجاد حیدر مرحوم سے میری آخری ملاقات یکم جنوری ۱۹۴۳ء کو
لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ میرے دوست سیّد محمد سبطین صاحب وکیل
پرتاب گڈھ کے لڑکے کی برات آئی تھی اور شب گذشتہ کو عزیزی
سید علی ظہیر بیرسٹر کی لڑکی سے جو ماشاء اللہ خود بھی بی۔ اے ہے
نکاح ہوا تھا۔ یکم جنوری کو دوپہر کی دعوت میں بہت سے دوستوں کا
مجمع تھا۔ سجاد حیدر بھی شریک تھے صحت اچھی نہ تھی، بہت سے
کپڑے پہن رکھے تھے۔ عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی تھی دو ڈھائی
گھنٹے تک بہت پُرلطف صحبت رہی۔ محمد سبطین صاحب خود بھی فارسی کے



اچھے ادیب ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں۔ بلا کا حافظہ ہے۔ سر رزیر حسن اور خان بہادر سید اصغر حسن بھی موجود تھے۔ دیر تک علی گڑھ کی پرانی صحبتوں کے تذکرے ہوتے رہے۔ زمانہ بڑی عجلت کے ساتھ بدل رہا ہے تاہم ہماری سوسائٹی کا ابھی تک یہ حال ہے کہ جہاں دس پانچ ذوقِ سلیم والے آدمی جمع ہو جاتے ہیں وہاں شعر و سخن کا تذکرہ ہونا لازمی ہے۔ چند ہفتے پہلے سر محمد یعقوب کی وفات پر میں ایک مضمون سرگزشت میں لکھ چکا تھا اس مضمون کی جو داد دورانِ گفتگو میں سجاد حیدر نے دی اسے میں کبھی نہ بھولوں گا۔ کہنے لگے تمھارا مضمون میں نے پڑھا اور میں اس سے اس درجہ متاثر ہوں کہ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ یعقوب مرحوم کا مرثیہ ضرور لکھوں گا جس میں ان حالات کا تذکرہ کروں گا جو تم نے اپنے مضمون میں لکھے ہیں۔ دنیا عجیب جگہ ہے۔ افسوس ہے کہ اس قدر جلد وہ وقت آگیا کہ مرثیہ لکھنے والے کا ہی مرثیہ کوئی اور لکھے۔ سجاد کی کس کس خوبی کا تذکرہ کیا جائے۔ علی گڑھ کے دورِ ثانی میں بڑی مشکل سے کوئی اور شخص ایسا ملے گا جس کی ذات میں اتنی جامعیت ہو جو سجاد حیدر کی ذات میں موجود تھی۔ مرحوم نے دوستوں کا وسیع حلقہ چھوڑا ہے جن میں بہتوں کی سجاد کے بعد یہ حالت ہوگئی ہے۔

شعر:۔ تمھارے بعد یہ ہے حال ہم صفیروں کا!
اس آشیاں میں صدا دی ادھر پکار آئے

سید اظہار الحسن، بی، اے ایل، ایل، بی

سیّد سجّاد حیدر

ادیبِ جمیل سیّد سجّاد حیدر، بی۔ اے انہٹور ضلع بجنور کے ایک ممتاز خاندانِ سادات کے چشم و چراغ ہیں جس کے اکثر افراد صاحبِ عزت و حشمت ہیں۔ لیکن جو شہرت اور عزت سید سجاد حیدر کو حاصل ہوئی، وہ کسی دوسرے کا مقدر نہ تھی۔ بچپن کے حالات زیادہ معلوم نہیں۔ لیکن کالج میں پہنچنے کے بعد ہی سے بہ قول حضرت سعدیؒ بالائے سرش ز ہوشمندی می تافت ستارۂ بلندی چمکنے لگا تھا۔ شبلیؒ جیسے باکمال اُستاد اور مولانا محمد علی اور حسرت موہانی جیسے صاحبِ ذوق رفیقوں کے فیضِ صحبت نے سید صاحب کی ہونہار طبیعت کے ساتھ سونے پر سُہاگے کا کام کیا۔ اور بالآخر سید صاحب نے دُنیائے ادب میں وہ پوزیشن حاصل کرلی جس پر ہر ایک ادیب کو بجا طور پر ناز ہوسکتا ہے۔

آپ کی شادی ضلع بلند شہر کے ایک معزز خاندان ہوئی ہے۔ اور

اُردو ادیبوں میں یہ فخر تنہا آپ کو حاصل ہے کہ آپ کی بیگم صاحبہ بھی دُنیائے ادب میں بلند مرتبہ رکھتی ہیں۔ محترمہ نذر سجاد صاحبہ عالمِ نسوان کا ایک گوہر رخشندہ ہیں اور ادبِ اُردو متعدد تصانیف کے لئے آپ کے رشحاتِ قلم کا ممنون ہے۔

علی گڈھ کالج نے اپنے پچیس سالہ دورِ حیات میں جتنے باکمال پیدا کئے۔ اُن میں سیّد صاحب کا درجہ بہت ممتاز ہے۔ کالج کی زندگی آپ نے نہایت ناموری کے ساتھ گذاری۔ انجمن اُردوئے معلّیٰ اور یونین وغیرہ کی خدمات آپ سے وابستہ رہیں۔ شاعری کا آغاز بھی اسی زمانہ سے ہوا۔ اور کالج کی چہل پہل اور روایتوں کے درمیان اُس کی پرورش ہوئی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد آپ برطانوی سفارت خانہ سے متعلق ہو کر بغداد شریف چلے گئے لیکن ادبی ذوق نے وہاں بھی اس غریب الوطن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اور "یلدرم از بغداد" کے اکثر مضامین ہندوستان کے اُردو رسائل بڑے فخر سے شائع کرتے رہے۔ فصیح الملک کا ماتم ارضِ عراق میں کیا۔ "بُنزئی جاپان بنزئی" کی مشہور رزمیہ نظم بھی سواحلِ دجلہ و فرات کے حصّہ میں آئی۔

علی گڈھ کالج کے سابق متعلمین کو جو وابستگی اپنی مادرِ تعلیمی کے ساتھ ہوتی ہے وہ کچھ اُنھیں کے لئے مخصوص ہے۔ سید صاحب کو بھی الفت کالج سے بہرہ وافر ملا ہے جس کا اظہار مختلف پہلوؤں سے ہوتا رہتا ہے مسلم یونیورسٹی کے آغاز سے سال گذشتہ تک آپ رجسٹرار اور شعبۂ اُردو کے اعزازی ریڈر

رہے۔ اسی دوران میں آپ نے مرحوم اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے حق میں مسیحائی کی۔ نہ صرف ایسوسی ایشن مذکور آپ کی ان تھک کوششوں سے از سرِ نو زندہ ہو گیا بلکہ اُس کی اپنی "لاج" بھی واپس مل گئی اسی زمانہ میں آپ ممالک ترکیہ کی سیاحت کے واسطے تشریف لے گئے۔ وہاں کے اکثر مشاہیر سے آپ کے دوستانہ تعلقات ہیں۔

سید صاحب مغربی تہذیب کو پسند فرماتے ہیں۔ لباس قطعی انگریزی ہوتا ہے۔ البتہ کبھی کبھی ترکی ٹوپی زیبِ سر فرما لیتے ہیں۔ طرزِ معاشرت میں بھی انگریزی تہذیب کی جھلک بہت نمایاں ہے قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ آپ ایک ایسے محکمہ سے وابستہ کر دیئے گئے جس سے آپ کی ادب دوستی کو قطعی کوئی مناسبت نہیں۔ یعنی آپ ڈپٹی کلکٹر ہیں۔

معارف (علی گڈھ) اُردوئے معلیٰ۔ مخزن (دورِ اوّل) زمانہ علی گڈھ میگزین۔ ہمایون۔ سہیل اور نیرنگ خیال کے صفحات اکثر آپ کے نقوشِ قلم سے مزین ہوتے رہے ہیں۔ "خیالستان" "حکایات و احساسات" "ثالث بالخیر" "زہرا" اور "جلال الدین خوارزم شاہ" آپ کی مستقل تصانیف ہیں۔ خیالستان اور حکایات آپ کے متفرق مضامین اور افسانوں کے مجموعے ہیں جن میں سے بعض طبعزاد ہیں۔ اور بعض ترکی وغیرہ سے ملخص اور ماخوذ۔ جلال الدین خوارزم شاہ" مشہور ترکی ادیب نامق کمال بے کے معرکۃ آلارا ڈرامہ کا بے مثل ترجمہ ہے۔

"ثالث بالخیر" اور "زہرا" بھی ترکی کے تراجم ہیں۔ اگرچہ سیّد صاحب فنِ شعر میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے ہیں لیکن اس صنف میں ہنوز کوئی مستقل تصنیف آپ کی شائع نہیں ہوئی ہے۔ اور نہ غالباً آپ ایسی کوئی تصنیف شائع کرنا پسند فرماتے ہیں۔

میر سوز مرحوم نے ایک دفعہ شاعروں کی کثرت کے سلسلہ میں کہا تھا ع

ڈھونڈھتے ہیں پر تخلص بھی نیا ملتا نہیں

سید صاحب نے اس مقولہ کو بالکل غلط ثابت کر دیا ہے۔ کم از کم میری نظر سے نہیں گزرا کہ اُردو کے کسی اور شاعر کا تخلص یلدرم ہو۔ اس سے آپ کی جدت پسندی کے علاوہ اُس شغف کا بھی اظہار ہوتا ہے جو آپ کو ترکی زبان و ادب سے ہے۔

سید صاحب ہندوستان کی اُن چند معدودے ہستیوں میں سے ہیں جن کو ترکی زبان و ادب میں دستگاہ حاصل ہے۔ آپ نے ترکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ترکی ادیبوں کے دل کش اور اچھوتے خیالات نے سید صاحب کی بے چین طبیعت پر خاص اثر کیا۔ یہاں تک کہ ترکیت نے آپ کی تصانیف میں مرکزی حیثیت حاصل کر لی۔ اُردو دان طبقہ کو ترکی ادب سے روشناس کرانے کا فخر تنہا سید صاحب کو حاصل ہے۔ آپ کے بیشتر مضامین اور تصانیف ترکی سے ماخوذ ہیں۔

اب سے کچھ عرصہ قبل اُردو میں ادبِ لطیف کا عنصر بالکل نہ تھا۔

یا نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس معاملہ میں بھی ادبِ اُردو سید سجاد حیدر کا نمونہ ہے۔ اس رنگ کو سچ پوچھو تو آپ نے چار چاند لگا دیئے۔ بہ قول ایک ناقد کے:

> "اس وقت ملک میں جتنے نمونے ادبِ لطیف کے موجود ہیں۔ ممکن ہے اُن کے متعلق اختلافِ آرا ہوسکے۔ لیکن سید صاحب کی تصانیف کے متعلق کبھی دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔"

سید صاحب ایک مخصوص رنگ کے مالک اور صاحبِ طرز اُستاد ہیں۔ آپ کا تتبع آسان کام نہیں اور یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص آج تک آپ کی کامیاب تقلید نہ کرسکا۔ آپ کی عبارت نہایت صاف، شگفتہ، پُرزور اور دل چسپ ہوتی ہے۔ کوئی مضمون یا افسانہ اُٹھا لیجئے۔ ناممکن ہے کہ آپ اُس کو ختم کئے بغیر چھوڑ دیں۔ جملوں کے اندر روانی اور جوش کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سلاست بھی ہاتھ سے جانے نہیں پاتی۔ موقع اور محل کا لحاظ بھی رہتا ہے۔ بندش بھی چست ہوتی ہے۔ اندازِ بیان کی رنگینی عبارت کو اور بھی دلاویز بنا دیتی ہے۔ غرض آپ کی تحریریں انشا پردازی کی جان اور فصاحت و بلاغت کا اچھا نمونہ ہوتی ہیں۔

آپ کے مضامین تخیل سے مالا مال ہوتے ہیں۔ آپ جس خیال کو اُس کی مکمل تصویر ناظرین کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ پڑھنے والا

یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ اُسی ماحول میں ہے جس میں کہ خود مصنف ہے
اور یہی تصنیف کا کمال ہے۔ ذیل میں آپ کے مضمون "ہجوم میں تنہائی" سے
ایک اقتباس پیش کرتا ہوں:-

"دوست سے دوست بچھڑ رہا ہے عاشق سے یا بالعکس

محبوبہ عاشق سے جدا ہو رہا ہے۔ ہار پہنائے جا رہے ہیں۔
گلدستے پیش کیے جا رہے ہیں۔ لنگر اٹھا جہاز آہستہ آہستہ
ساحل سے ہٹنا شروع ہوا۔ رخصت کرنے والوں کی ساحل اور ڈیک پر
صفیں کھڑی ہو گئیں۔ رومال کبھی آنکھوں پر جاتے ہیں کبھی ہلتے ہیں۔
کوئی مسکرا مسکرا کر جانے والے کو سلام پیش کر رہا ہے۔ جانے والا ساحل کے
دوست کو اشارے سے کچھ آنے کی دعوت دیتا ہے۔ پرندۂ وداع،
حزن و فراق دونوں یہاں موجود ہیں۔ جہاں ہر طرف سے الجھا ہوا
تصور ہے کہ ہوا، وہاں اپنا ہاتھ جیب میں ہونا بھی دل پر
عجیب اثر کرتا ہے۔ میں ہجوم میں تنہا ہوں۔

"ان سینکڑوں رومالوں میں سے میرے لیے ایک بھی
جنبش نہیں۔ اور نہ میرا ہاتھ رومال کو اُس کے آرام کی جگہ سے
کسی کے لیے باہر لانے کی کوشش کرتا ہے۔"

"جس طرح کسی دوسرے سیارہ کا باشندہ ہمارے
حرکات کو بے پروایانہ انداز سے دیکھتا ہوگا اسی طرح میں
اس ہجوم کی حرکات پر نظر ڈال رہا ہوں۔ انداز بے پروایانہ ہے

مگر نظر رشک آمیز ہے۔"

آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ محض چند جملوں میں اس زبردست ادیب نے کتنی کامیاب مصوری کی ہے۔ جہاز کے ساحل چھوڑنے کی مکمل تصویر پیشِ نظر ہوجاتی ہے۔ کیا "ہجوم میں تنہائی" کی اس سے بہتر مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ آخری فقرہ بجائے خود ایک تصویر ہے۔

مزاح (Humour) کا عنصر بھی آپ کے مضامین میں بہت نمایاں ہوتا ہے۔ اور جس خوبی سے آپ اس کو نبھاتے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ ظرافت کے پیرایہ میں واقعات کا خاکہ کھینچنا بلکہ فطرت کی مصوری کرنا آپ کا خاص انداز ہے۔ لیلیٰ مجنون کے واقعات بہت فرسودہ ہوگئے ہیں۔ اور اب اُن میں دل فریبی کی شان پیدا کرنا آسان کام نہیں۔ لیکن سیّد صاحب نے اس "ایامِ جاہلت" کے فسانہ کو کچھ اس طرح سے بیسویں صدی کے "متمدن" دَور سے متعلق کر کے پیش کیا ہے کہ بے ساختہ ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ حکایہ لیلیٰ مجنون پڑھیئے اور سیّد صاحب کے کمال کی داد دیجئے۔ ضمنی طور پر جو نوٹو تہذیب مغربی اس فسانہ میں پیش کیا گیا ہے، وہ خاص طور پر قابلِ التفات ہے۔ اس فسانہ کا اقتباس پیش کرنا دراصل مصنف پر ظلم کرنا ہے۔ اس کا لطف اُٹھانا ہو تو "خیالستان" ملاحظہ فرمایئے لیکن میں اس کا آخری جزو یہاں پیش کرتا ہوں جس سے سیّد صاحب کی شانِ انشاپردازی کا اندازہ ہوسکے گا:۔

"قیس کا باپ اپنے "دُنیا کی نظر میں دیوانے" بیٹے کی حالت سے مایوس ہو کر اجابتِ دعا کی اُمید میں کہ آیا۔ وہاں آیا۔

جہان ہرشخص اپنی عزیزترین تمنّالے کرآتا ہے۔ اور جہان
جس در کے سامنے جس چھت کے نیچے سب سے زیادہ صمیمی،
سب سے زیادہ دِلی دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ یا زیادہ صحیح
یہ کہ ہرجگہ سے زیادہ قوی امید اجابت کے ساتھ تخت سماوی
کی طرف جاتی ہین (درتصمیمیت تو دُنیا کے ہرگوشہ مین فریاد قلب
کررہی ہے) وہان وہ اُسے لیکر پہنچا۔ خود خضوع و خشوع سے
دعا مانگی اور قیس سے بھی کہا کہ اپنی قابلِ رحم حالت سے
نجات پانے کے لئے دستِ دعا اُٹھائے"
"اور قیس نے دستِ دعا اُٹھائے۔ اور انتہائے صمیمیت
غایت تضرع سے، اعماق دل سے نکلنے والی صدائے دعا مانگی۔
مگر کیا؟ وہی جو اُس نے سیکڑون برس پہلے مانگی تھی۔ اور جو
ہرقیس طبیعت چاہے وہ کہین ہو، اور کسی زمانہ مین ہو، مانگیگا:-
"مین جس مصیبت مین مبتلا ہون، خدا کرے وہ کبھی
کم نہ ہو۔"
سیدسجاد حیدر قدرت کی طرف سے گداز دل لے کرآئے ہین۔ فطرت نے آپ کو
شاعر پیدا کیا ہے۔ اور شعریت آپ سے جدا نہین ہوسکتی آپ نے نثر مین بھی
شاعری کی ہے۔ "خارستان اورگلستان" اور حضرتِ دل کی سوانح عمری جو
اُنھون نے اپنے کاتب خصوصی سیّد سجاد حیدر سے لکھوائی۔ پڑھیے۔ کیا آپ
اس کو شاعری نہ کہین گے۔

حضرتِ دل فرما رہے ہیں :۔

"دوسری حسین اور خوب صورت چیز جس نے مجھے اپنی طرف کھینچا وہ شمع تھی۔ یہ لوریہ عریاں مجھے گھنٹوں محوِ حیرت رکھتا تھا۔ اور کہیں قریب ہوا تو میں اُس سے ملنے کے لئے بے اختیار اُس کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا۔"

"لیکن یہ کیا ؟ مجھے روکتے تھے۔ کیوں ؟ کیوں مجھے اس حسین شے سے ملنے نہیں دیتے تھے ؟ اس لئے کہ پہلے کی طرح ہر حسین شے شفیق نہیں۔ یہ حقیقت ، یہ دل کش حقیقت مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ اچھا ہوتا جب ہی معلوم ہو جاتی۔"

خط کشیدہ عبارت کسی شعر سے کم دل چسپ نہیں۔ جنابِ دل اپنا معرب کا تجربہ یوں بیان فرماتے ہیں :۔

"مگر معرب میں سب سے زیادہ ظالم (فریاد۔ فریاد اُن کے ستموں سے) وہ تھے جو تیر مارتے تھے۔ برچھیاں کبھوتے تھے، لیکن جب ہم شکایتیں کرتے تھے تو صاف مگر جاتے تھے "ہم نے نہیں مارا" پہلے تو میں اسے بناوٹ سمجھا۔ ملتجی نظروں سے اُن کی طرف دیکھا اور عرض کیا "میں آپ کو جھوٹا نہیں بنانا چاہتا لیکن میں نے دیکھا کہ آپ نے تیر مارتے۔"

"میری ملتجی آنکھوں کا اُن آنکھوں سے ملنا تھا کہ سیکڑوں

ہزاروں تیروں کی پے در پے بوچھاڑ پڑنے لگی۔ مگر اُن کو
اُس وقت عین اس بوچھاڑ کے وقت بھی اپنی بے تقصیری پر
اصرار تھا۔"

"یہ ہم پر بہتان ہے۔ تیر دیر کیسا (اور آنکھوں میں
آنسو بھر لائے) ہم کچھ نہیں جانتے۔ اور ہزاروں تیر برسا
دیئے۔ تم اس قدر زخمی کیوں نظر آتے ہو کس نے گھایل کیا؟"
اور ایک نظر، ایک ترحم انگیز اور ہوش رُبا نظر ڈالی اور
ایک لاکھ برچھیوں نے مجھے چھلنی کر دیا۔"

"ہے ہے، اس قدر نہ تڑپو، کس بے رحم نے تمھیں خون میں
شرابور کر دیا۔ مگر خیر یا کی کٹر یاسے اور کچوکے لگا دیئے۔ بعد میں
معلوم ہوا کہ حقیقت میں اُنھیں اپنے ظلموں کی خبر نہیں۔ تیروں کی
بوچھاڑ عمداً نہیں کی جاتی بلکہ اپنے آپ ہوتی رہتی ہے۔ اُف!
اُف! خدا ان تیراندازوں سے پالا نہ ڈالے۔ کھلے بند قزاق
زخم لگا کے بھاگ جانے والے قزاق اچھا ٹھگ۔ ان سب سے
میں سینہ سپر ہو سکتا ہوں اور ہوا ہوں لیکن اس تیسری صنف سے
تاب مقاومت نہیں۔ نہیں بالکل نہیں۔"

میں نہیں سمجھ سکتا کہ شاعری میں اس سے زیادہ کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اگر یہ
شاعری نہیں تو کیا ہے۔

آپ کے مضامین کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے گرد و پیش کے

حالات پر گہری نظر ڈالنے اور معمولی معمولی واقعات سے اہم نتائج اخذ کرنے کی عادت ہے۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ "انسان کے لئے بہترین مضمون مطالعہ خود انسان ہے۔" سید صاحب نے بھی اس "طرفہ معجون" کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ "چڑیا چڑے کی کہانی" سب نے اپنے بچپن میں سُنی ہوگی۔ سید صاحب نے بھی یہ کہانی اپنے مخصوص طرز میں لکھی ہے۔ اس سے جہاں آپ کی جدت پسندی، انوکھے طرزِ بیان اور زبان پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے فطرتِ انسانی کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ دو بے زبان جانوروں کی زبانی جبلت انسانی کو بے نقاب کر دیا ہے۔ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" کس قدر دل کش مضمون ہے کتنا دل فریب انداز بیان ہے۔ کیا یہ آپ کا روزمرہ کا تجربہ نہیں کہ "دوستوں" میں آپ کا کس قدر وقت ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات کتنا بے محل دخل درمعقولات آپ کے نظام میں دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی آپ خود بھی پریشان ہو جاتے ہیں۔ لیکن آپ مجبور ہیں۔ آپ کو سب برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اور اگر اس پر بھی آپ دوست نہیں ہیں تو آپ خود کو بدقسمت سمجھیں گے۔ یہی معمولی باتیں ہیں جن کو سجاد حیدر نے اپنے اچھوتے انداز میں پیش کر دیا ہے۔ سر سید نے بھی ایک مضمون میں مہمان نوازی کے طریقوں پر نکتہ چینی کی تھی۔ لیکن دونوں میں فرق محض اتنا ہے کہ سر سید کا مضمون کسی زاہدِ خشک کا وعظ ہے۔ اور سجاد حیدر کا فسانہ کسی زندہ دل کا چبھتا ہوا فقرہ۔ آپ خود خیال کر لیجئے کہ اثر کس کا زیادہ ہوگا۔

محترمہ ز۔ خ۔ ش صاحبہ ضلع علی گڈھ کے مشہور شروانی خاندان کی ایک رُکن اور دَورِ موجودہ کی ایک باکمال اور ادب نواز خاتون تھین۔ جنھون نے عین عالمِ شباب مین سفرِ آخرت اختیار فرمایا۔ اس سانحۂ جان گزا سے جو ناقابلِ تلافی نقصان ادبِ اُردو کو پہنچا اُس سے سیّد صاحب کا حساس دل تلملا اُٹھا اور حُسنِ عقیدت کے یہ پھُول "ہمایون" کے صفحات پر بکھیر دیئے گئے:۔

"وہ عندلیبِ خوش الحان جس کے عرفان پاش نغمے اس کے قفس کی تیلیون سے نکل نکل کر ایک عالم کو مسحور کر رہے تھے یکایک خاموش ہوگئی نغمے فضا مین متلاطم ہین۔ مگر عندلیب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ساکت! وہ حقیقت طراز گر شیرین آواز سراپردۂ دولت کے پیچھے سے (جہان سے بے معنی خندہ اور فضول مکالمہ کے سوا کچھ کم سُنائی دیتا ہے) سُنا رہی تھی کہ صدق وصفا، علم وعرفان، سوز والتہاب، درد وگداز کیا ہین۔ اور صدق وصفا، علم وعرفان، درد وگداز سوگوار ہین کہ اُن کی مشاطہ اُن کو دلآویز آرائشون مین اب پیش نہ کرے گی۔

وہ ایک عندلیب تھی جو قفس مین پیدا ہوئی۔ قفس مین جی۔ اور اُس نے قفس ہی مین دم توڑا۔ اس چند گز نیلگون آسمان کے سوا جو اُس کے صحن خانہ پر حسرت بار رہا۔

اُس نے فطرت کی زیبائش، آفریدۂ دستِ انسان کی آرائش
نہ دیکھی۔ آفتاب جو دُنیا کو حرارت بخشتا ہے تیلیوں کے لپیٹے
ہوئے کپڑے سے گزر نہ سکا لیکن خود اُس کے قلب منوّر نے
ایک شمع روشن کی جس نے اُسے باہر کے نُور سے بے نیاز کر دیا۔
شمع تخیل!

وہ اپنی مختصر مگر متجلّی زندگی میں اپنے تئیں خاک نشین
ز۔خ۔ش کہا کی۔ آج حقیقتاً وہ خاک نشینی کی آرزومند
آسودۂ خاک ہے ع

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

مرزا داغ اور امیر مینائی کے مرثیے نظم میں ہیں۔ مگر آپ نے لاحظہ فرمایا کہ
یہ مرثیہ نثریہ بھی کس قدر پُرسوز وتاثیر ہے۔ خاتون اور مرحومہ کی حیات اور تصانیف پر
ایک مجمل مگر مکمل تبصرہ ہے۔ بندشوں کی چستی اور موزونیت۔ الفاظ کی برجستگی،
عبارت کی بے ساختگی اور روانی سب نے ملکر مرثیہ کو کتنا پُراثر بنا دیا ہے۔
مولانا حسرت موہانی نے ایک دفعہ مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر کی تعریف
اپنے ایک شعر میں اس طرح فرمائی تھی ؎

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں بھی مزا نہ رہا

ابوالکلام کی نثر میں کس کو کلام ہوسکتا ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ
حسرت کے رفیق التعلیم یلدرم کی نثر بھی نظم پر فوقیت رکھتی ہے۔

"ثالث بالخیر" "زہرا" اور "جلال الدین خوارزم شاہ" ترکی کے تراجم ہیں اور ان کا کمال یہ ہے کہ تراجم معلوم نہیں ہوتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس میدان میں سید صاحب کو خاص مہارت ہے۔ ترکی سے جس قدر نفیس ترجمہ آپ کرتے ہیں وہ آپ اپنا جواب ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ترجمہ میں اس کا لطف باقی نہیں رہا کرتا۔ مگر سید صاحب بعض اوقات ترجمہ کو اصل سے زیادہ دل چسپ بنا دیتے ہیں۔ "جلال الدین خوارزم شاہ" سید صاحب کا تازہ کارنامہ ہے۔ ترکی میں اس ڈرامہ کو کلاسکس کی حیثیت حاصل ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اردو میں بھی اس کی یہ حیثیت برقرار رہے گی اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ اس میں اب تک بلند پایہ ڈراموں کی بہت کمی ہے۔ عامیانہ مذاق کے ایک دو نہیں درجنوں ڈرامے موجود ہیں لیکن ذوقِ صحیح مفقود ہے۔ اور (بعض قابلِ تعریف مستثنیات کو چھوڑ کر) قومی خدمت کا خیال عنقا۔ اس طوفان بدتمیزی میں سید صاحب کی یہ کاوش مستحق ہزار تحسین ہے۔

خدا اس زندہ دل ادیب کو عمر دراز ارزانی فرمائے کہ اس کی ذات سے اردو ادب کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ کاش مسلم یونیورسٹی کو اتنی توفیق ہو کہ وہ سید صاحب کی خدمات اردو ریڈری کے لئے حاصل کر لیں۔ ایسے لوگ روز روز نہیں ملا کرتے۔ ع

یاد رکھنا فسانہ ہیں یہ لوگ

مولانا سید سلیمان ندوی

سجاد حیدر یلدرم

۱۲- اپریل ۱۹۴۳ء کی رات کو سید سجاد حیدر مرحوم نے، جو ادب کی دنیا میں یلدرم کے نام سے مشہور تھے، قلب کے عارضہ سے دفعتہً وفات پائی۔ یہ علی گڑھ کالج کے پرانے تعلیم یافتوں میں، اور اسی تعلق سے کالج کے ان چند طالب علموں میں تھے جنھوں نے مولانا شبلی مرحوم کے درس اور صحبت سے شعر و ادب کا ذوق حاصل کیا تھا۔ مرحوم مولانا کے درس کے اس قسم کے واقعات کو مزے لے لے کر بیان کرتے تھے۔

ہماری زبان میں اس وقت ادبِ لطیف کا جو رواج ہے اس کے پرانے لکھنے والوں میں سب سے پہلا نام سید سجاد حیدر مرحوم کا ہے اور چونکہ قادرِ مطلق کو ان سے یہ کام لینا تھا، اس لئے ان کی زندگی میں

اس کا مناسب سامان پیدا کر دیا تھا یعنی یہ کہ کالج سے نکلنے کے ساتھ ان کو ترکی پڑھنے کا خیال ہوا علی گڈھ مین نواب محمد اسمٰعیل خان صاحب رئیس علی گڈھ کے والد بزرگ وار ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے وہین نواب محمد اسمٰعیل خان صاحب کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اس زمانہ مین ترکی وہان کی سرکاری زبان تھی۔ اس لئے ان کو ترکی بھی پڑھائی گئی۔ اور جب ہندوستان آئے تو وہ ترکی ادب کے گویا نمایندے ہو کر آئے۔ چنانچہ سرسید کے "تماشائے عبرت" مین وہ اسی ہئیت سے اسٹیج پر آئے ہین۔ اور معارف علی گڈھ مین جس کے وہ شریک اڈیٹر تھے، وہی ترکی ادب کی اشاعت کا ذریعہ بنے۔

بہرحال سجاد حیدر مرحوم نے ان ہی سے ترکی زبان سیکھی۔ اور اس کا یہ فائدہ ان کو پہنچا کہ سرکار انگریزی نے ان کو ترکی سفارت خانہ مین لے لیا۔ اور عراق مین ان کا تقرر ہو گیا۔ یہ سنہ ۱۹۰۰ء کے پیش و پس کا واقعہ ہے۔ جدید ترکی ادب پر فرانسیسی ادب کے بے حد اثرات تھے۔ مرحوم نے ترکی ادب کے ان ہی اثرات کو قبول کیا۔ اور ان کو اردو ادب مین منتقل کیا، اسی زمانے مین سنہ ۱۹۰۱ء سے مخزن لاہور نے جنم لیا تھا۔ مرحوم نے ترکی ادب کا یہ تحفہ عراق سے ہندوستان کو بھیجا۔ اور مخزن کے خوانِ ادب مین یہ شہر بہ شہر ہاتھون ہاتھ بٹا۔ اس کے بعد بھی ترکی کا سفر انھون نے خود کئی دفعہ کیا۔ ور ترکی ادبیات د

رسائل ان کے پاس آیا کرتے تھے۔

ان مضمونوں میں وہ شاید سرکاری ملازم ہونے کے سبب سے اپنے نام کے بجائے یلدرم لکھا کرتے تھے۔ جو مشہور ترکی سلطان بایزید کا لقب تھا۔ جس کے معنی بجلی کے ہیں۔ چونکہ وہ اپنے دشمنوں کی بے خبری میں ان کے سروں پر اس تیزی سے آ کر گرتا تھا کہ لوگ اس کو یلدرم کہتے تھے۔

بہر حال سجاد حیدر یلدرم ہماری زبان میں ایک نئی صنف ادب کے بانی تھے۔ اور اس لئے ہماری ادبی تاریخ میں ان کا ایک پایہ ہے۔ وہ کئی ادبی افسانوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ وہ بڑے متواضع، مرنج و مرنجان، ہنس مکھ، ملنسار، شگفتہ دل، بذلہ سنج، اور شریف و نرم طبع تھے۔ ان کے دوستوں کو ان کی یاد بہت آئے گی۔ ان کی وفات کا حادثہ لکھنؤ میں پیش آیا۔ اور وہیں کی خاک کے سپرد ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر اپنے فیضِ کرم کے چھینٹے برسائے۔

شوکت تھانوی

سجّاد حیدر یلدرم

بچپن سے سیّد سجّاد حیدر یلدرم اور نذر سجّاد حیدر صاحبہ کے نام سُنتے چلے آرہے تھے۔ مضامین اور افسانے برابر پڑھتے تھے۔ مگر ملاقات ہوئی لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر۔ یوں دیکھ چکے تھے علی گڑھ میں بھی۔ دبلے پتلے۔ دھان پان۔ ترکی ٹوپی پہنے ہوئے گویا مہاتما گاندھی۔ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ مگر اب تک شرمیلی طبیعت ہے۔ اپنی ادبی خدمات کا شاید احساس ہی نہیں، غرور تو دوسری چیز ہے۔ اپنے سامنے کے ادبی بچوں کا بھی اس انداز سے احترام کرتے ہیں گویا آپ خود تو کچھ ہیں ہی نہیں۔ جو کچھ ہیں یہ نئی پود کے برخوردارانِ ادب ہیں۔

مختصر افسانہ نگاری کے باوا آدموں میں سے سجّاد حیدر بھی ایک ہیں۔ ایک زمانہ میں آپ کی نظمیں بھی پڑھی تھیں۔ مزاحیہ بھی

اور سنجیدہ بھی مگر اب طرح سے کچھ نہیں کہتے۔ افسانے لکھنے بھی بہت کم کردیئے ہیں۔ گویا ادب کے بھی منشتر ہوکر بیٹھ رہے ہیں۔

میں یہ سطریں لکھ ہی چکا تھا کہ سجاد حیدر یلدرم کے سفرِ آخرت کی خبر بھی سُن لی۔ افسانہ نگار خود افسانہ بن کر رہ گیا ——

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یادِ یلدرم

آہ سجّاد حیدر یلدرم

ادب چمن ہے تو اس کی بہار تھا سجّاد
عروسِ علم و ہنر کا سنگار تھا سجّاد

لطیف صنفِ ادب کے ہیں آج سب قائل
لطیف صنف کا پروردگار تھا سجّاد

ادب کے باغ میں یوں تو بہت ہیں لالہ و گل
مثالِ فوجِ نسیمِ بہار تھا سجّاد

گرچہ اہلِ قلم کو کہیں ادب کو لڑی
تو اس لڑی میں دُرِ شاہوار تھا سجّاد

بڑھا وہ مرکبِ شہرت پہ یوں کہ گر نہ سکا
رہِ ادب کا عجب شہسوار تھا سجّاد

نئے پرانے سب ہی اہلِ علم مان گئے
ادب میں وہ زرِ کامل عیار تھا سجّاد

وہ اس کا طرزِ نگارش کہ دل میں گھر کر لے
ادیب تھا کہ کوئی سحر کار تھا سجّاد

ادب میں اس کی اور چمک نہ ہو کیوں کر — کہ ترجمانِ دلِ بے قرار تھا سجاد
زبان کو رنگ رنگ کو زبان بخشی — فسوں طراز تھا سحر نگار تھا سجاد
اگرچہ پیر تھا وہ، تھا ادب جوان اس کا — خزاں میں مثلِ گلِ نو بہار تھا سجاد
حسین ادب تھا حسین تر تھی زندگی اس کی — ادب کا آپ خود آئینہ دار تھا سجاد
ادیب تھا اور ادیبوں کا سرپرست بھی تھا — ثبوت یہ ہے مرا غم گسار تھا سجاد

جلیل اس کی میں رحلت پہ خون کے آنسو
نہ کیوں بہاؤں کہ یاروں کا یار تھا سجاد

جلیل قدوائی ایم اے
شعبۂ اردو جامعہ علی گڈھ

سجاد حیدر مرحوم

دلی تاسف کے ساتھ یہ خبر پڑھنے میں آئی کہ سید سجاد حیدر بی اے کا لکھنؤ میں ۱۲-اپریل (۱۹۴۳ء) کو دفعتاً انتقال ہوگیا۔ ایک زمانہ میں اردو کے مشہور لکھنے والے تھے۔ انگریزی میں بھی کبھی کبھی لکھتے رہے۔ قلمی نام "یلدرم" تھا۔ ترکوں کے عاشق تھے۔ ساتھ ہی اقبال کے بھی پرستار تھے۔ اردو میں لکھتے اس وقت سے تھے جب ان سطور کے راقم کو (بمحاورۂ عام) قلم پکڑنے کی بھی تمیز نہ تھی۔ اس نے بھی ادب میں اچھا خاصہ استفادہ سید صاحب کی تحریروں سے کیا۔ ایک زمانہ میں مذہب سے بہت ہٹے ہوئے تھے لیکن مہذب، شائستہ، مستعلیق اس وقت بھی رہے۔ بدزبانی، دل آزاری اس وقت بھی روا نہ رکھی۔ اب تو ماشاءاللہ خاصے مذہبی ہوگئے تھے۔ کئی سال ہوئے حج بھی کر آئے تھے۔ اور خانۂ کعبہ پر ایک نظم بھی لکھ لائے تھے۔ عموماً شعر نہ کہتے بس ایسے ہی تاثر کے موقع پر لکھ لیتے۔ لے دے کے ایک تجدد کا اثر اب بھی باقی رہ گیا تھا۔ حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے اور لغزشوں پر خط عفو پھیر دے۔

شادی خاندان سے باہر ایسی خاتون سے کی تھی جو اپنے

زمانہ میں ایک مضمون نگار تھیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی
صدق ۲۶۔ اپریل ۱۹۴۲ء

ایک ادبی سانحہ

سید سجاد حیدر یلدرم، ہندوستان کے وسطی ادبی دور کے مشہور انشا پرداز نے یہیں لکھنؤ میں انتقال کیا۔ اور اس طرح کہ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ مرحوم یوں تو عرصہ سے ذیابیطس کے مرض میں مبتلا تھے لیکن ان کی مرنج و مرنجان فطرت نے انھیں عمر طبیعی سے پہلے جانے نہ دیا۔ اور وہ گئے بھی تو قلب کی حرکت بند ہو جانے سے، جو موت کا غالباً واحد ادبی پہلو ہے۔

نیاز فتح پوری
نگار۔ مئی ۱۹۴۳ء

کمالِ یلدرم

ادبِ لطیف کا پیش رو

آج کل رنگ و بُو کی دُنیا "ادبِ لطیف" پر مٹ رہی ہے۔ پیرس کی نازنین نے ایک عالم کو اپنی عشوہ گری سے مسحور کر رکھا ہے۔ مشرقی زبانوں میں فرانسیسی نزاکت کا بار جس نے پہلے اُٹھایا وہ مشرق کا وہ سپاہی ہے جس کا کم از کم تین سو برس سے یورپ کے مشقِ ناز کا نشانہ ہے یعنی ترک۔ ترکوں نے جب بیداری کی نئی کروٹ لی تو پیرس ہی کی محبوبہ کو پہلو میں پایا۔ اس لئے فرانسیسی ہی کی تعلیم ان میں پھیلی اور اس سے نئی ترکی زبان پر فرانسیسی ادب کا گہرا اثر پڑا۔ ہندوستان کی تقدیر نے سجاد حیدر ایک علیگ طالب علم کو ترکی پڑھوایا اور اس لگاؤ سے ترکی سلطنت میں برطانوی سفارت کے لئے

کارآمد ٹھیرایا۔ اس نئے "زبانی قرب" کے ساتھ اس کو ترکوں کا "مکانی قرب" بھی بخشا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یلدرم نے آج سے پچیس برس پہلے ترکی مقبوضات کو ہندوستانی مفتوحات کی صورت میں بدلنا شروع کیا۔ اور یہ پہلا موقع ہے جس میں ہماری زبان نے اس "ادبِ لطیف" کے نمونے دیکھے جن کی مسخ شدہ تصویریں آج ہر اُردو رسالے کے صفحات پر نظر آتی ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی
مقدمہ مکتوبات مہدی

رشک اور ادبیت

سید سجاد حیدر کی جگہ کا بھی حریص نہیں ہوں۔ اور ہمدرد نے تو اس خبر وحشت اثر کو سنتے ہی اظہارِ افسوس بھی کر دیا تھا۔ ایک مردِ دانا علی گڑھ میں ایک ادبی شہرت رکھتا ہے اس کو وہاں رکھنا لوگوں کو گوارا نہیں۔ تاہم مجھے ان کی تنخواہ پر رشک نہیں۔ ان کی ادبیت پر رشک ہے۔ لیکن وہ ادب کے لئے وضع کئے گئے تھے اور ہم

بے ادبی کے لیے۔

ما و مجنون ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق

او بہ صحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

میں نے ہمدرد جاری کرتے وقت انھیں اس کی ایڈیٹری کی دعوت دی تھی مگر وہ قبول نہ ہوئی ۔۔۔۔۔

مولانا محمد علی

ہمدرد ۲۱ ۔ اپریل ۱۹۲۸ء

جدّت اور اچھوتا پن

سیّد سجّاد حیدر یلدرم کی طرزِ تحریر میں جو بات ہمیں سب سے زیادہ پسند ہے وہ اس کی جدّت اور اچھوتا پن ہے۔ جب کبھی وہ کچھ لکھتے ہیں، نظم ہو یا نثر اس میں ایک اندازِ خاص ہوتا ہے جس کا لطف جاننے والے جانتے ہیں۔ مگر یہ محبت والفت کا فسانہ (خارستان و گلستان) جس کی تلخیص کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں، ان کی روش کے اعتبار سے بھی زمانۂ جنگ کا ہے تخیل کا جو کمال اس میں دکھایا گیا ہے بہت کم

دیکھنے مین آتا ہے ۔

سر عبدالقادر
مخزن جون سنہ ۱۹۰۶ء

اُردو کا ایلن پو

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو زبان مین مختصر افسانہ انگریزی زبان سے آیا ہوگا۔ مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی کا خیال ہے کہ غالباً سب سے پہلے اودھ اخبار مین مختصر افسانون کے تراجم شائع ہوئے اور بعد مین خود ان کے رسالے معارف مین جس کا ہم نام اب اعظم گڈھ سے شائع ہوتا ہے، سید سجاد حیدر یلدرم نے بھی کچھ افسانے لکھے۔ اس لحاظ سے شاید ہم یہ کہنے مین حق بجانب ہون گے کہ جس طرح دُنیائے مغرب مین پو کو مختصر افسانہ نویسی کا مُوجد کہا گیا ہے، سید سجاد حیدر اُردو زبان مین طرز جدید کے مختصر افسانے لکھنے والے پہلے شخص ہین۔

شمس العلماء تاجور نجیب آبادی
مقدمہ "منتخب افسانے"

نشتریت

سید سجاد حیدر نثر افسانہ نما خوب لکھتے ہیں۔ عبارت بہت دل فریب اور اس میں ایک خاص نشتریت ہوتی ہے۔ ترکی جانتے ہیں اور ایک ترکی ڈرامہ موسوم بہ خوارزم شاہ کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے۔

رام بابو سکسینہ
تاریخ ادب اُردو

فنی کارنامہ

ہم نے لیلیٰ و مجنون کے افسانے کو کئی بار پڑھا ہوگا مگر سجاد حیدر یلدرم جب اس قصے کے قدیم چوکھٹے میں نئی تہذیب کی تصویریں پہناتے اور ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں تو ہماری نظریں عجیب حیرت و استعجاب سے اس پر گڑ جاتی ہیں۔ اور اختتام تک وہاں سے ہٹنے کا نام نہیں لیتیں۔

لیلیٰ کا ناقہ محمل سے اُگتا، کر موٹر میں تفریح اُڑانا، مجنوں کا بائیسکل پر سوار ہو کر نجد کی گلیوں میں مارا مارا پھرنا، خارِ مغیلاں کی قدیم عداوت کا نئی شکل میں نمودار ہونا، یہ تمام ایسے واقعات ہیں جن کو پڑھ کر ہم بے ساختہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ "یہ فنی کارنامہ ہے"۔

پریم چند اور سدرشن دونوں کے قصوں میں مقامی رنگ کی بہترین جھلکیں موجود ہیں جس سے نیاز کے اگلے اور سجاد حیدر یلدرم کے اکثر قصے خالی نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اوّل الذکر قصہ نگاروں پر رومانیت اسی قدر زیادہ غالب ہے۔ لیکن ہر ایک کی دل چسپی اسی سے مخصوص ہے۔

جو اسلوب نیاز اور سجاد حیدر نے اپنے قصوں کے لئے انتخاب کیا وہ اس قسم کے قصے کے لئے نہایت موزوں ہے۔ اگر کبھی کبھی صداقت افسانے سے زیادہ تعجب خیز ہوتی ہے تو افسانے صداقت سے زیادہ دل چسپ بھی۔ اور یہی قول نیاز اور سجاد حیدر کے قصوں پر صادق آتا ہے۔ ان کی پیدا کردہ رومانی فضا میں ہم صداقت کی کمی محسوس کرنا بالکل بھول جاتے ہیں۔ اور یہی سب سے زیادہ تعریف کسی ادبی کارنامے کی ہو سکتی ہے کہ جب وہ سامنے ہو تو کوئی دوسری شئے سامنے نہ ہو ...... نیاز اور سجاد حیدر کے قصوں سے نہایت بلند تخیل کا ثبوت ملتا ہے۔ نیاز نے کیوپڈ اور سائکی میں جہاں سائکی کی اس حالت کا نقشہ دکھایا ہے جس میں کسی چاہنے والے کے نہ ہونے کے غم میں وہ خود فراموش ہو جاتی ہے ایک فنی شہ پارہ ہے۔

اسی ایک واقعہ سے نیاز کے "تصویری بیانات" کا بھی ثبوت ملتا ہے ـــــ
سجاد حیدر یلدرم نے بھی "خیالستان" میں ایک بہترین تخیلی تصویر ایسی
لڑکی کی کھینچی ہے جس کو محبت کرنے والے کی تلاش ہے ۔ اس خاص
نقطۂ نظر سے سجاد حیدر کے بیانات آگے نکل جاتے ہیں سجاد حیدر یلدرم کے
اکثر قصے اس امر کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں کہ مستعمل مضامین اور
قصے جب ایک کامل فن کے ہاتھ لگتے ہیں تو ادب کے لئے گراں مایہ ناز
بن جاتے ہیں ؎

مُردہ بھی بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں!

گر اس خصوصیت میں نیاز بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں کہ
ان کے غیر زبانوں کے ترجمے بعض وقت اصل سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔
..... سدرشن اور پریم چند قارئین کو مسرور ضرور کرتے ہیں لیکن
پڑھنے والوں کو ادبی نزاکتوں سے مخمور بنا دینا نیاز اور سجاد حیدر کا
کام ہے۔

عبدالقادر سروری
دُنیائے افسانہ

مخصوص انداز بیان

سید سجاد حیدر صاحب یلدرم اپنے ترکی ترجموں کی وجہ سے ملک میں

کافی شہرت رکھتے ہیں۔ نامق کمال بک کے ترکی ڈرامے "جلال الدین خوارزم شاہ" کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ نامق کمال بک ترکی ادبیات جدید کے زندہ جاوید بانیوں میں سے ہے۔ ترکی زبان اور انداز یلدرم کا اپنا مخصوص ہے۔

سیّد بادشاہ حسین

اُردو میں ڈرامہ نگاری

چار درویش

حیدر حسن۔ سجّاد حیدر۔ اور محمد حیات (سر سکندر حیات خان کے والد) تینوں بی۔ اے میں تھے۔ سجّاد حیدر انگریزی اور اُردو دونوں بڑی اچھی لکھتے اور بولتے تھے۔ انشا پردازی کی سُنہری لڑیوں میں موقع محل سے ہمیشہ لطافت اور بذلہ سنجی کے موتی پروتے تھے۔ مطالعہ کا دائرہ بہت وسیع تھا۔

سر سیّد رضا علی

اعمال نامہ

اُردو علم ادب کی جان

اس زمانے میں سید سجاد حیدر صاحب یلدرم نواب محسن الملک بہادر یا یوں کہو کہ سکریٹری صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری تھے۔ صاحب موصوف کی ذہانت کی کالج میں شہرت تھی۔ بدن میں پھرتی اور چہرے پر شگفتگی تھی۔ سوٹ پہنتے اور بلا تیلیوں کی ناک پکڑنے والی عینک لگاتے تھے۔ اور شوقِ تحریر مضامین میں گھلے جاتے تھے ..... لوگ کہتے ہیں کہ ان کے بعض ناول اُردو علم ادب کی جان ہیں۔

غلام پنجتن

علیگیات

طرزِ انشا کے پاکیزہ نمونے

اُردو زبان کے محسن اور ہماری یونیورسٹی کے مشہور ادیب

سید سجاد حیدر بی اے ان زندہ دل بزرگوں میں سے ہیں جو اپنے چند در چند مشاغل اور کثرتِ کار کے باوجود ادبِ اردو سے جیتے جی دست بردار نہیں ہو سکتے۔ ان کا ذوقِ ادب ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی نیا میدانِ عمل تلاش کر لیتا ہے۔ زمانہ جانتا ہے کہ اردو زبان میں ادبِ لطیف کا رنگ انھیں کا جمایا ہوا ہے۔ اس وقت ملک میں جتنے نمونے ادبِ لطیف کے موجود ہیں ممکن ہے ان کے متعلق اختلافِ آرا ہو سکے لیکن سید صاحب کی تصانیف کے متعلق کبھی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ ان کے طرزِ انشا کے جتنے پاکیزہ نمونے اب تک ملک میں پیش کیے گئے ہیں سب میں ان کے حسنِ خیال اور ندرتِ احساس کی جھلک ہے۔ ان کا ذوقِ صحیح انھیں کبھی عام راستے پر نہیں چلنے دیتا۔ وہ ہر مرتبہ ایک نرالی شان سے جلوہ آرا ہوتے ہیں۔ ترکی ترجموں میں انھیں جو مہارت ہے اس کی بنا پر مشہور ہے کہ "خیالستان" کے "خارستان و گلستان" ترکی زبان میں اس قدر شگفتہ و دل کش نہیں جتنے دل چسپ انھوں نے ترجمہ کر کے ہمارے لیے بنائے ہیں۔

ایڈیٹر علی گڈھ میگزین

مارچ۔ اپریل مئی ۱۹۲۶ء

برجستگی اور ندرت

جن لوگوں نے کامیابی کے ساتھ اُردو میں دوسری زبانوں کے افسانوں کو ترجمہ کرکے اس ادب کو گراں بہا بنانے کی کوشش کی ہے ان کی فہرست میں سجاد حیدر کا نام زریں الفاظ میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ غالباً وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس سلسلہ کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اُردو میں ترکی افسانوں کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔ ترکی تخیل کو اُردو کے پیرایہ میں اس طرح منتقل کیا ہے کہ ترجمہ میں اصل کی شان آگئی ہے۔ ترکی طرزِ معاشرت وحسن ادا کو اُردو کی دُنیا میں مانوس ہونے کے لئے آپ نے اکثر اُردو ترکیبوں میں اجتہاد سے کام لیا ہے۔ اور خوشی یہ ہے کہ بیشتر مقامات پر ان کو ایسی اثر پذیر کامیابی ہوتی ہے کہ اس خدمت کو اُردو ادب میں ایک اضافہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر کبھی کبھی اپنے لطیف جذبات کو بیان کرنے کے لئے ایسی ایسی ترکیبیں اور الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جو سننے والے کو غیر مانوس معلوم ہوتے ہیں۔

ترکی ترجموں کی کثرت کا یہ نتیجہ ہوا کہ سجاد حیدر صاحب کے طبع زاد افسانوں میں بھی ترکی افسانوں کی رومانیت جا بجا

نظر آنے لگی۔ آپ کے ترجموں میں وہ برجستگی اور ندرت ہوتی ہے کہ وہ بذاتِ خود ایک تصنیف کا مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ پڑھنے والے کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے یا کسی کے ذاتی تخیل کا نتیجہ۔ ایک تو الفاظ کا انتخاب عمدہ اور پھر ان کو نہایت موزوں جگہ سے ترتیب دینا یہ موصوف کا وہ کرشمہ ہے جو ان کی نثر میں شاعری کا مزہ پیدا کر دیتا ہے جہاں جہاں یہ خوبی پیدا ہو گئی ہے، اس نے افسانوں کو جنت نگاہ، اور عبارت کو فردوسِ ہوش بنا دیا ہے۔ سجاد حیدر صاحب کے طبع زاد افسانوں میں اکثر حیاتِ انسانی کی نفسیاتی تحلیل ہوتی ہے۔ اور ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو حیات و جذبات انسانی کی نقاب کشائی میں خاص ملکہ ہے جس کو ان کی افسانہ نویسی کا ایک خاص جزو سمجھنا چاہیے۔ وہ اپنے افسانوں میں نفسیات کی ان خشک بحثوں میں نہیں پڑتے جو ایک فلاسفر کو دنیا کا خشک ترین انسان بنا دیتا ہے۔ سجاد حیدر صاحب کے یہاں کبھی فطرتِ انسانی کا مطالعہ اس لطیف طرز پر ہوتا ہے کہ قلب میں ایک انبساطی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو کبھی کردار افسانہ سے وہ اٹکھیلیاں ہوتی ہیں کہ تبسم کی لہریں قہقہوں سے بدل جاتی ہیں۔

ان کے افسانوں کا مجموعہ "خیالستان" دنیائے اردو میں کافی ہر دلعزیزی حاصل کر چکا ہے۔ جس میں کچھ افسانے تو ترکی ادب سے آئے ہیں اور کچھ انگریزی سے لیکن زیادہ تعداد طبع زاد افسانوں کی ہے۔

طبع زاد افسانوں کی خوبیوں کے انبار میں ایک خرابی بھی نظر آتی ہے
کبھی کبھی افسانہ افسانہ ہی ہو کر رہ جاتا ہے یعنی اصلیت اور واقعہ
دونوں مشکوک نظر آتے ہیں۔ بہر حال "خیالستان" کے محاسن اتنے ہیں کہ
زمین دار اخبار کی رائے ہے کہ:

"اُردو زبان کی ادبیاتِ لطیف میں "خیالستان" سے
بہتر کتاب نہیں۔"

اس مجموعہ کے علاوہ ان کا ایک ناول زہرہ ہے جو بہت مشہور و
قابلِ دید ہے۔ یہ مصر کی قصہ کا آزاد ترجمہ ہے لیکن بہت عمدہ ہے۔

سید اعجاز حسین ایم اے
مختصر تاریخ ادب اُردو

بلندیٔ تخیل اور زورِ بیان

آپ کے افسانوں کا مجموعہ "خیالستان" کے نام سے دُنیائے ادب میں
کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس میں کچھ افسانے تو ترکی افسانوں کے
ترجمے ہیں، کچھ انگریزی کے اور کچھ طبع زاد ہیں۔

حضرت نیاز کی طرح سجاد صاحب بھی خیالی پیکر بنانے میں خاص کمال رکھتے ہیں۔ جذبات نگاری میں بھی آپ کا مرتبہ کافی بلند ہے۔ وہ افسانے جو غیر زبانوں سے ترجمہ ہوئے ہیں وہ اپنی بلندیٔ تخیل اور زورِ بیان کے لحاظ سے اکثر اصل افسانوں سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ اور لطف یہ کہ ترجمہ اس سلیقے سے ہوا ہے کہ کہیں ترجمہ کا گمان نہیں ہوتا۔

صغیر احمد جان ایم اے
تفہیر ادیب

کلامِ یلدرم

"سید سجاد نثرِ شعر نما خوب لکھتے ہیں، عبارت دل فریب اور اس میں ایک خاص نشتریت ہوتی ہے"[1] یہ تاریخ ادبِ اُردو کے ایک مورخ کی رائے ہے، اور سجاد حیدر یلدرم مرحوم کی تحریروں کے مداحوں کو بھی اس رائے سے پورا پورا اتفاق ہے، لیکن ان کے کم مداحوں کو یہ معلوم ہے کہ یلدرم شعر بھی کہتے ہیں جس میں ان کی مخصوص نشتریت ایک نئے رنگ میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔

اُردو کے ایک مشہور مذاحیہ نگار نے یلدرم مرحوم کو ان کے آخری زمانے میں دیکھا ہے، لکھتے ہیں: "بوڑھے ہو چکے ہیں، مگر اب تک شرمیلی طبیعت ہے اپنی ادبی خدمات کا شاید احساس ہی نہیں، غرور تو دوسری چیز ہے"[2]

---

[1] بابو سکسینہ، تاریخ ادبِ اُردو۔ [2] شوکت تھانوی: شیش محل ص ۱۵۳

یہی افتادِ طبیعت تھی جس کی وجہ سے غالباً یلدرم نے کبھی اپنے کلام کا مجموعہ شائع کرنے کا ارادہ نہیں کیا، اور تنک بندوں اور قافیہ پیماؤں کی طرح صاحب دیوان ہونے کی ہوس انھیں دامن گیر نہ ہوئی، ان کے کلام کا یہ مختصر سا مجموعہ مختلف رسائل کے سینکڑوں اوراق گردانی کا نتیجہ ہے۔ بہت ممکن ہے ان کا اور بہت سا کلام ان کی بعض نثری تصانیف کی طرح ابھی غیر مطبوعہ حالت میں موجود ہو، تاہم جو کچھ قابل حصول تھا اسی کو یلدرم کے شاعرانہ کمال کے اعتراف اور ایک ادبی یادگار کی حیثیت سے شائع کیا جا رہا ہے۔

یلدرم "عموماً شعر نہ کہتے، بس ایسے ہی تاثر کے موقع پر کہہ لیتے" [1] یہ اُردو کے ایک مسلّمہ ادیب کی رائے ہے اور یلدرم کی پوری شاعری اس کی گواہ۔ ان کی شاعری دلی تاثرات اور احساسات کا ایک جیتا جاگتا مجموعہ ہے، تک بندی، قافیہ پیمائی یلدرم کا کبھی شعار نہیں رہا، آورد کے عیب سے ان کی شاعری ہمیشہ پاک رہی۔

"سید سجاد حیدر صاحب اس معنی میں شاعر نہیں تھے کہ وہ بڑے بڑے مشاعروں میں داد سخن حاصل کرتے اور صاحب دیوان ہوتے۔ لیکن اس معنی میں شاعر ضرور تھے کہ شعر کہتے اور اچھا شعر کہتے تھے، ان کا توسنِ طبع جس طرح نثر میں شوخ و طرار تھا اسی طرح نظم میں بھی ہوا سے باتیں کرتا تھا۔" [2]

اس مشاعرہ بازی سے گریز کے سلسلہ میں لکھنؤ ٹریننگ کالج کے مشاعرہ کی

---

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی: صدق، ۲۶ اپریل ۱۹۴۳ء۔

[2] پرنسپل مشتاق احمد زاہدی: سجاد حیدر بہ حیثیت شاعر۔ ادیب۔ ستمبر ۱۹۴۳ء۔

صدارتی نظم یلدرم کی افتادِ طبیعت پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ اس نظم سے ایک طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یلدرم کو اپنی نثر کا احساس تو تھا لیکن اپنی شاعری کا اعتراف نہ تھا اپنے مخصوص منکسرانہ انداز میں فرماتے ہیں:

لیکن نہیں شاعری کا دعویٰ ہاں نثر میں کچھ کیا ہے تحریر
یہ شوخی تخلص ہے ورنہ کیا ہیچ مداں کی ہیچ تحریر

"نوجوان سے" میں بھی یلدرم نے یہی پیغام دیا ہے کہ نوجوان تنگ بندی کو اپنا شعار نہ بنا کر میدانِ عمل سے نہ ہٹ جائیں۔

اس مجموعہ کی پہلی نظم "مرزا پھویا" ہے جو خیالستان سے لی گئی ہے۔ یہ یلدرم کے طالب علمی کے زمانے کی پیداوار ہے، اور علی گڑھ کی طالب علمانہ زندگی کا ایک دلچسپ مرقع ہے، اس کی شانِ نزول کے متعلق سجاد کے ایک ہم درس اور ہم سن دوست زاہدی صاحب کا بیان سنئے:

"یہ نظم شروع میں "تفنن طبع" ایک دو ورقی اخبار میں نکلی تھی۔ یہ اخبار علی گڑھ کالج میں خفیہ طور پر طلباء کے تفنن طبع کے لئے وقتاً فوقتاً نکلا کرتا تھا کبھی دستی لکھا ہوا اور کبھی چھپا ہوا .... اس نظم میں لکھنؤ کے ایک نوجوان علی گڑھ کالج میں نئے نئے داخل ہو کر اپنے گھر خط لکھتے ہوئے کالج کی زندگی کے مصائب کا رونا روتے دکھائے گئے ہیں۔ ان نوجوان صاحب کی نظمی تصویر جو سجاد حیدر صاحب نے کھینچی ہے وہ "مرزا پھویا" کے نام ہی سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ "مرزا پھویا" کالج میں

"خالہ اماں" کہلاتے تھے، کیونکہ جس دن پہلی دفعہ یہ اگلے سے اُتر کر بورڈنگ میں داخل ہوئے ہیں تو حضرت ڈھیلا پاجامہ پہنے ہوئے تھے اور پاؤں میں گھیتلی جوتی اور لطف یہ ہے کہ ہاتھ میں ایک پاندان لٹکائے ہوئے تھے، اس ہیئت کذائی کو دیکھتے ہی یار لوگوں نے ان پر خالہ اماں کی پھبتی کہہ دی، جو ہمیشہ کے لئے چپک کر رہ گئی۔ مگر سید صاحب نے اپنی نظم میں ان کو "مرزا پھویا" کا خطاب دے کر ان کے حلئے کو بدل دیا۔ ان صاحب کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں۔ صرف اتنا اتا پتا کافی ہے کہ وہ ہمارے مشہور قومی کارکنان میں سے ہیں۔ ایک زمانے میں جیل کی ہوا کھا آئے ہیں۔ مزدوروں کے زبردست حامی ہیں اور ہندوستان کے مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ اگرچہ وہ بہت مال دار نہیں ہیں، اور اس لئے جاہ پرست الخ کو لیڈر نہیں مانتے، لیکن ان کو لیڈر بننے کی حسرت بھی نہیں"۔[1]

اس "حسرت" کے بعد اور کیا اتا پتا بتایا جا سکتا ہے!

اس مجموعہ کی دوسری نظم "شملہ کالکا ریلوے اسٹیشن پر ایک نظارہ" یلدرم کی بہت مشہور نظم ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ جاپانی مصوری کی طرح چند آڑے ترچھے خطوط میں ایک چوکڑیاں بھرتے بے چین د

---

[1] ادیب ستمبر ۱۹۴۳ء۔

مرحوم آہو کی زندہ تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے، پہلی دفعہ یہ نظم علی گڑھ میگزین میں شائع ہوئی تو رشید احمد صدیقی نے اس تاثر کی شدت کو دیکھ کر کتنے اشتیاق سے لکھا تھا:

"... علی گڑھ میگزین کی جدید ترین اشاعت میں "شملہ کالکا ریلوے اسٹیشن پر ایک نظارہ" دیکھ کر معلوم ہوا کہ ہنوز سید صاحب "ریل" پر "آہو" دیکھ لیا کرتے ہیں، اس لئے عجب نہیں کہ موصوف صرف تھوڑی سی کوشش فرما کر "حضرت دل کی سوانح عمری" از سر نو جدید حالات و حوادث کے ماتحت مرتب کر سکیں"[1]

کچھ اسی قسم کی نظم "دیکھا نظارہ ہم نے تہوار" بھی ہے۔

ایک نظم کا عنوان ہے "نغمۂ مسرت" اس کے تیسرے بند کے بارے میں جلیل احمد قدوائی کی ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ اس "دیا ہمور" بلدۂ شعر و موسیقی' لاہور کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے"[2]

بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم کسی دوست کی شادی کی تقریب میں لکھی گئی ہے، لیکن الفاظ کی نشست، ترکیبوں کی بندش، خیال کی ندرت، جاپانی مصوری کی طرح چند خطوط میں منظر نگاری، اور سب سے بڑھ کر بے ساختگی اور ترنم نے اس نظم میں ایک عجیب

---

[1] سہیل ستمبر ۱۹۲۶ء۔ [2] نیرنگ خیال، سالنامہ ۱۹۲۸ء۔

کیفیت پیدا کر دی ہے۔

دوستوں کی خوشیوں اور مخصوص تقاریب کے سلسلہ سید صاحب نے جو نظمیں کہیں، ان کے ذیل میں "نذرِ خواجگان" اور ایک "بت پرست محمود" آجاتی ہیں، اس آخری نظم کے متعلق علی گڑھ میگزین کے مدیر نے کتنی سچی بات کہی ہے:۔

"مکرمی سجاد صاحب یلدرم اردو انشاء پردازی کے علاوہ نظم میں بھی طرزِ بیان کے موجد ہیں، یہ نظم انھوں نے مکرمی خواجہ غلام السیدین صاحب کی شادی میں لکھی تھی، اس نظم سے وہی لوگ زیادہ محظوظ ہو سکتے ہیں جو سجاد صاحب کے بے تکلفانہ اندازِ بیان، ندرتِ تخیل، ازدواجی زندگی کے مسئلہ پر سیدین صاحب کی ذاتی رائے، اور اس وقت کی مقامی فضا سے کافی آشنا ہوں"[1]

نواب صاحب چھتاری کے نام جو تہنیت نامہ لکھا گیا ہے، وہ کوئی پیشہ ورانہ قصیدہ نہیں، اقبال کی طرح امیروں کی مدح پیرائی یلدرم کا شعار نہیں، یلدرم نے نواب صاحب کو چند مخلصانہ نصیحتیں کی ہیں، بہ قول زاہدی صاحب "سنا گیا ہے کہ نواب صاحب والاشان نے ان اشعار کو خوش خط لکھوا کر اپنے کمرے میں نصب کر رکھا ہے" حقیقت میں سید صاحب نے جو نصیحت کی ہے وہ سونے کے حرفوں میں

---

[1] علی گڑھ میگزین، جلد ۸، شمارہ ۱، نومبر ۱۹۳۰ء

لکھنے کے قابل ہے۔"

ایک اور نظم ہے "دعا" جو ایک نا کتخدا عزیزہ کے آٹو گراف البم میں لکھی گئی تھی، خیال کیجئے ایک نا کتخدا عزیزہ کو اس سے بہتر اور کیا دعا دی جا سکتی ہے، غالباً یہ عزیزہ وہی ثروت آرا مرحومہ ہیں جن کا دردناک مرثیہ اس مجموعہ میں شامل ہے۔ اسی طرح سر محمد یعقوب کا مرثیہ بھی ایک ہم دم دیرینہ کی یاد میں" سجاد کے دلی جذبات کا آئینہ اور ایک سوگوار دل کا صدائے نالہ ہے۔

"ہندوستان کی تقدیر نے سجاد حیدر ایک علیگ طالب علم کو ترکی پڑھوایا اور اس لگاؤ سے ترکی سلطنت میں برطانوی سفارت کے لئے کارآمد ٹھیرایا۔ اس نے زمانی قرب کے ساتھ اس کو مکانی قرب بھی بخشا، نتیجہ یہ ہوا کہ یلدرم بن کر آج پینتیس برس پہلے ترکی مفتوحات کو ہندوستانی مفتوحات کی صورت میں بدلنا شروع کیا، اور یہ پہلا موقع ہے جس میں ہماری زبان نے اس "ادب لطیف" کے نمونے دیکھے جن کی مسخ شدہ تصویریں آج ہر اردو رسالے کے صفحوں پر نظر آتے ہیں۔"[1]

ان ترکی مفتوحات میں متعدد اعلیٰ درجے کے افسانوں،

---

[1] مولانا سید سلیمان ندوی، مقدمہ مکتوبات مہدی ص ۸ و ۹۔

ناولوں اور ڈراموں کے علاوہ دو ترکی نظمیں "ترانۂ شوق" اور "بلبل" بھی ہیں۔ ان کے سوا طارق کے کچھ منظوم حصص بھی ہیں، افسوس ہے ان کا یہ ڈرامہ ان کے سانحۂ ارتحال کی وجہ سے نگارمیں چھپتے چھپتے ناتمام رہ گیا۔

ملازمت کے سلسلہ میں یلدرم کچھ عرصے کے لئے جزائر انڈمن میں بھی رہے ہیں، یہ مقام گورے آدمیوں کے لئے جنت اور ہندوستانی کالے کلوؤں کے لئے منحوس زندان ہے! یہاں سے ایک نظم لکھی ہے "قیدِ خود اختیاری" اس کے بارے میں جلیل احمد قدوائی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ڈیر جلیل — یہ تو آپ سُن ہی چکے ہونگے کہ میں نے ہندوستان پھر چھوڑ دیا، دو برس کے لئے جلا وطنی اختیار کرلی! یہاں فرصت بھی ہے اور تنہائی، اس لئے کبھی کبھی شعر بھی کہہ لئے جاتے ہیں، چنانچہ یہاں پہنچ کر جو لکھا ہے اس میں سے کچھ پیش کرتا ہوں"[1]

سجاد حیدر یلدرم کی ادبیت، اور علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی ناقدری کا ماتم کرتے ہوئے یلدرم کے ایک اور نامور ہم درس نے

---

[1] سید سجاد حیدر یلدرم کے خطوط، ہمایوں۔ جولائی ۱۹۴۳ء۔

شکوہ کیا ہے:

"سجاد حیدر کی موت اس دردناک حقیقت کو یاد دلاتی ہے کہ علی گڑھ میں علمی ذوق کی قدر کبھی نہیں ہوئی۔"[1]

خود یلدرم نے بھی اپنے ایک خط میں اس بد مذاقی کی شکایت کی ہے:

"علی گڑھ میں اردو کے ایم اے اور آنرز کی کلاس کھلنا علی گڑھ کی روایات کے عین مطابق ہوگا، اور وہ دن بہت مبارک ہوگا جب ایسا ہو رہا آپ احباب کی یہ کوشش کہ مجھے علی گڑھ دوبارہ بلائیں، مجھے اس کی کامیابی میں شبہ ہے، خداوندان یونیورسٹی ع

ملاتے ہیں اسی کو خاک میں جو دل سے ملتا ہے۔"[2]

"علی گڑھ مسلم یونیورسٹی" والی نظم میں اسی بد مذاقی، اور ہماری قومی بے حسی کا نقشہ کھینچا ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ایسا طرز عمل کچھ مسلم یونیورسٹی کا ہی حصہ نہیں، اور اس کے لئے صرف اسی کے خداوندانِ یونیورسٹی ہی مطعون نہیں۔ بلا مبالغہ ہندوستان کی ہر جامعہ کا یہی حال ہے، اور بلا استثنٰی یہ کاغذی ٹوپی ہندوستان کی ہر جامعہ کے سر پر ٹھیک اترتی ہے۔

---

[1] ۔ سر علی رضا، سجاد حیدر یلدرم مرحوم، جامعہ، جولائی ۱۹۴۳ء۔

[2] ۔ ہمایوں، جولائی ۱۹۴۳ء۔

یلدرم "ایک زمانہ میں مذہب میں بہت ہیٹے تھے، مگر مہذب، شائستہ، مستعلیق اس وقت بھی رہے، بدزبانی، دل آزاری، اس وقت بھی روا نہ رکھی۔ اب تو ماشاءاللہ خاصے مذہبی ہوگئے تھے، کئی سال ہوئے حج بھی کر آئے تھے، اور خانہ پر ایک نظم بھی لکھ لائے تھے"[1]

اس سفرِ حج پر گئے کس طرح اس کی تفصیل سُنئے:

"سجاد صاحب کی طبیعت اچھی نہ تھی، یعنی مرض ذات الجنب سے خدا خدا کر کے نجات پائی تھی، مگر ان کو حج بیت اللہ کا شوق ایسا دامن گیر ہوا کہ گھر والوں سے لڑ بیٹھے اور کسی کے روکے نہ رُکے، چنانچہ اس عزم کا اظہار اس رنگ میں کیا ہے:

کوئی اب شامل ارباب وفا ہوتا ہے"[2] (عقدۂ لاینحل)

حج بیت اللہ کا شوق لئے جہاز رحمانی میں سوار ہوئے، اسی کے عرشہ سے اپنے دلی کیفیات کا اظہار "عزم حجاز" میں کیا ہے، اور مومن کے مشہور مصرع "مومن چلا ہے ایک بت پارسا کے ساتھ" پر نہایت دلکش انداز میں تضمین کی ہے۔ میاں بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

---

[1] مولوی عبدالماجد دریابادی۔ صدق۔ ۲۶۔ اپریل ۱۹۴۳ء۔

[2] زاہدی۔ ادیب۔ ستمبر ۱۹۴۳ء۔

"مکرمی۔ ہندوستان چند ماہ کے لئے چھوڑ رہا ہوں ـــــــ اور جا کہاں رہا ہوں؟ کعبے کو ـــــ اس بوالعجبی پر چند اشعار میں اظہار خیال کیا ہے ۔

اب تو جاتے ہیں بُت کدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا!"

کعبے کے سامنے پہنچے تو جذبات کا دریا اور بھی امڈا، اپنے مالک سے شکوہ و شکایت اور حرف و حکایت ہونے لگی، دنیائے اسلام کی حالت اور یورپی دول کی حرص و آز سے کس مسلمان کا دل رنجور نہیں۔ کعبے کے سامنے کھڑے ہو کر کس درد سے فرماتے ہیں:

یہ سب تو ہے مگر مرے اللہ یہ نہ ہو۔
اغیار دخل پائیں ترے آستانے میں!

آگے سُنئے:

واقف ہے تو کہ درد بھرا ہے ہمارا حال
کیا تیرے آگے درد بھروں اس فسانے میں

غرض "سجاد حیدر یلدرم" ہماری زبان میں ایک نئی صنف ادب کے بانی تھے، اور اسی لئے ہماری ادبی تاریخ میں ان کا ایک پایہ

ل ۔ مئی ۱۹۳۴ء۔

ہے۔[1]

یلدرم کا یہ پایہ اور درجہ اُردو نثر میں بھی ہے اور اُردو نظم میں بھی۔

---

[1] مولانا سید سلیمان ندوی۔ معارف۔ مئی سنہ ۱۹۴۳ء۔

مرزا پھویا علی گڈھ کالج مین

ہو وطن سے کبھی جُدا نہ کوئی ۔ گھر سے بے گھر ہو اے خدا نہ کوئی
دردِ غربت سہا نہین جاتا ۔ رنجِ فرقت کہا نہین جاتا
یاد احباب کی جو آتی ہے ۔ دل مین اک درد سا اُٹھاتی ہے
بی بی بچون کا آگیا گر دھیان ۔ سینہ کوبی سے ہو گئے ہلکان
گھر کے نقشے کا دل مین پھر جانا ۔ اس کا سو سو جتن سے بھر جانا!
گھر سے بے گھر جو کوئی ہو جائے ۔ عیش و آرام اس کا کھو جائے
نئی دُنیا بشر نیا دیکھے ۔ گویا عالم ہی دوسرا دیکھے
الغرض یہ مصیبت ایسی ہے ۔ ساری دُنیا کے غم مین کم جس سے

اب سُنین، صاحبانِ ہوش و ذکا ۔ اک نیا ماجرا نیا قصّہ
ایک صاحب اودھ مین رہتے تھے ۔ مرزا پھویا، سب ان کو کہتے تھے
کیا کہون تھا کہان چمن اُن کا ۔ لکھنؤ تھا کبھی وطن اُن کا
گھر سے نکلے نہ تھے وہ ساری عمر ۔ گویا بھونرے ہی مین گزاری عمر

اپنے ماں باپ کے دلارے تھے
اور عزیزوں کے وہ پیارے تھے

خیر سے تھا ابھی شباب شروع
عمر کا بیسواں تھا باب شروع

رات دن کھیلتے مگر پھرتے
سارے گھر والے "بچہ" کہتے تھے

باتیں کرنے میں بھی لجاتے تھے
غیر شخصوں سے سہم جاتے تھے

عیش سے دن مگر گزرتے تھے
نہ کسی کا خیال کرتے تھے

چین تھا دن کو لطف راتوں میں
وقت کٹتا تھا یوں ہی باتوں میں

کہ فلک ہو گیا خلل انداز
تجھ سے سمجھے خدا ارے دم باز!

دُور پھینکا وطن سے ہائے غضب
آخر اس دشمنی کا کوئی سبب؟

اس کی تفصیل اس طرح سُنئے
درد مرزا کی پھر دوا کیجئے

قوم میں سب سے اعلیٰ و ادنیٰ
محسن الملک، محسن الدولہ

دردِ قومی کے اس معالج نے
یعنی سکریٹری کالج نے

اپنے احباب کی معیت سے
اور مشاہیر کی جماعت سے

سارے شہروں کا جب کیا دورہ
لکھنؤ بھی مشرف اس سے ہوا

دھوم تھی اک فصیح آیا ہے
نیچری فوج ساتھ لایا ہے

وقتِ تقریر اس کا طرزِ بیان
گہ شرربار، گاہ نور فشان

جادو کرتا ہے، سحر کرتا ہے
مہر کرتا ہے، قہر کرتا ہے

گہ ہنساتا ہے گہ رُلاتا ہے
کچھ عجب ڈھنگ اس کو آتا ہے

جب ہوئے ان کے دست مایۂ بعد
تب تو مرزا کے والد ماجد

جا کے جلسے میں خود شریک ہوئے	سارے کچھ بغور انھوں نے سُنے
کر لیا ان پہ جادو اپنا کام	تھا علی گڑھ کا ہی زبان پر نام
ایک دم یہ تہیہ کر بیٹھے	بس علی گڑھ میں جا کے مرزا پڑھے
اس ارادے کو جب کہا گھر میں	پڑ گیا رونا پیٹنا گھر میں
چیخی مرزا کی ماں کہ: "ہائے ہائے!	کوئی جا کر ذرا انھیں سمجھائے
ان کو تو ہو گیا ہے کچھ سودا	سوچتے ہی نہیں بُرا و بھلا
میرا بچہ نہ جائے گا کوئل	میرا پتھر کا تو نہیں کچھ دل
پر انھوں نے سُنی کسی کی بھی	اپنی ضد ہر طرح سے پوری کی
ہو گیا حکم "جائیے مرزا کل"	ہائے! یہ حکم تھا پیامِ اجل
[illegible] سفر کی تیاری	اُن پہ ہوتی تھی زندگی بھاری
[illegible] رخصت تھا مرزا پر	چاہتے تھے۔ مرد ہیں چھوڑ کے گھر
[illegible] لیکن نہ کرتے دھرتے تھا	ماں نے جو کہا، انھوں نے کیا
خالہ اماں، ممانی، بھابی جان	اپنے مرزا پہ سب ہوئیں قربان
یا الٰہی یہ خیریت سے پھرے	اور دشمن پہ اس کے بجلی گرے
واسطہ مرتضیٰ علی کا تجھے	جلد لا کر ملائیے ہم سے"
اشک برسا کے دیدۂ تر سے	کیا کہوں مرزا چل دیے گھر سے
خیر سے پہنچ گئے وہ یہاں	آہ برلب، درونِ سینہ فغاں
ایک ہفتہ تو کاٹا رو دھو کر	بعد ہر طرح سے زچ ہو کر
اک عریضے کی یوں بنا ڈالی	قبلہ ام مدظلہ العالی

اولاً مجرا عرض کرتا ہوں — حال پھر اپنا عرض کرتا ہوں
ہو کے رخصت جناب سے پہنچا — کیا کہوں اس جگہ پہ کیا دیکھا
یاں کے لڑکوں کا حال ہی ہے جدا — ایسا دیکھا کبھی، کبھی نہ سنا
جنس ہر اک نئی، دکان نئی — اور تو اور، ہے زبان نئی
ایک وال "ایک گوشت" کہتے ہیں — جانے کس دیس میں یہ رہتے ہیں
ہوں پریشان تو "آلیا" فرمائیں — خوش ہوں گر تو "ہیر ہیر" یہ سنائیں
گر ہو اچھا لباس "ٹھاٹ" کہیں — اور گنواروں کو "راج گھاٹ" کہیں
جو تنعم کی ہو ذرا سی بھی — اس کو کہتے ہیں یاں پہ "عیاشی"[1]
عمدہ کھانا کھلانا عیاشی — عمدہ شربت پلانا عیاشی
عطر میں گر جو کپڑے بسائیں — فوراً عیاش آپ یاں کہلائیں
کورنش، مجرا، بندگی، آداب — سب کی یاں ہو گئی ہے مٹی خراب
ان کے بدلے ہے بس سلام علیک — گویا ڈھیلا کھینچ مارا ایک
دوڑتے کودتے، اچھلتے ہیں — بھول کر بھی نہ سیدھے چلتے ہیں
کوئی مارے پھلانگ تو یہ خوش — ٹوٹ جائے جو ٹانگ تو یہ خوش
گیند بلا، سواری اور فٹ بال — یہ یہاں کے ہیں کھیل، یہ اشغال

---

[1] ۔ یہ اصطلات وہ ہیں جو میرے زمانۂ علی گڑھ میں رائج تھیں۔ غالباً اب بھی ہوں گی۔ چونکہ مرزا پھویا میرے زمانۂ کالج میں تشریف لائے تھے، لہٰذا انھیں اصطلاحات کا ذکر کیا گیا۔ (سجاد)۔

گر پڑے کوئی گر تو خوش ہو جائیں — اور پھر خوب خوب تالی بجائیں

صبح ہوتے ہی کرتے ہیں ڈسپیل — نہ جبیں پر شکن، نہ دل پر میل

صبح تڑکے، ڈرل کراتے ہیں — ایسے بے رحم ہیں تھکاتے ہیں

جو تو اعداد کراتے ہیں سب کو — کیا دعا دوں میں ایسے بے ڈھب کو

ہو گئی میری جان بھی سہنے کل — جب وہ چیخے: "بریک ان ٹو ڈبل"

حکم ہے وقت پر ہی کھانا کھاؤ — شام کو جمع اک جگہ ہو جاؤ

بھوک ہو یا نہ ہو نہیں پروا — ہے اسی وقت ٹھونسنا پڑتا

یاں کی آزادی ہے بہت محدود — شہر جانا بھی ہو گیا مسدود

اس لئے عرض ہے کہ یہ چیزیں — لکھنؤ سے روانہ آپ کریں

ایک ڈبیہ دیا سلائی کی — پوڈر یا اک نیلی روشنائی کی

اک برش جوتہ صاف کرنے کا — اور برانکو بھی ساتھ تھوڑا سا

لوٹ کے لیمن کی ضرورت ہے — اور موزے بھی چند اچھے سے

دو گھڑے، اک صراحی، پیالے چار — اور ممکن ہو گر تو تھوڑا اچار

اور باقی تو خیریت ہے سب
سب کو تسلیم زیادہ حد ادب

شملہ کالکا ریلوے پر ایک نظّارہ

ماتھے پہ بندی
آنکھوں میں جادو
ہونٹوں کی بجلی
گرتی تھی ہرسو
چال لچکتی
بات بہکتی
جیسے کسی نے
پی ہو دارو
انکھڑیاں ایسی
جن میں تھے رقصاں
لمحہ میں رادھا
لمحہ میں راہو
ایسی پھڑک تھی
خلق تھی حیراں
ریل پہ آیا
کہاں سے آہو.

نغمۂ مسرّت

گُل ریز ہے دشت و دمن — گُل پاش ہے صحنِ چمن
ہر سو طرب جلوہ فگن — صوفی بھی ہے کیا شوخ دہن
آئی بہار اب پھر چمن — ہے بلبل و گُل کا وطن
دیر و حرم ہے نعرہ زن — آئے ہیں شیخ و برہمن

یاں جو ہے وہ گُل پیرہن — رنگیں بیاں رنگیں سخن
ہاں مطربا! بربط بزن — ساقی! مرا از پا فگن
زاہد سے کہہ دو یہ سخن — ہے فصلِ گُل توبہ شکن
گر چاہیے عیشِ جان و تن — مے خواروں کے سیکھے چلن

اس شہر کے پیر و جوان — ہیں خوش لقا و خوش بیان
یہ دل ربا و دل ستان — دل باختہ دل دادہ آں

لیلیٰ طبع ، مجنوں وشان — مہر و وفا کے راز دان
دل دار بام و آستان — دل دار ہر اک مرد و زن

اک دشمنِ ایمان و دین — ثانی نہیں جس کا کہیں
چنگیز جس کا خوشہ چین — مذہب ہے جس کا غیظ و کین
ایسا شقی اک نازنین — وحشت فزا قہر آفرین
خون ریز جس کی آستین — قاتل کی جس کی جبین

خندان و خوش آیا یہاں — مسرور تھا اور شادمان
رخ پہ مسرت تھی عیاں — لب پر خوشی کی داستان
تیر و تبر تیغ و سنان — رکھ کر ہوا سجدہ کنان
کرنے لگا وردِ زبان — شکر خدائے ذوالمنن

جب شادیاں ہوں ہر طرف — جب رنج و غم ہو بے طرف
خوشیاں کھڑی ہوں صف بصف — ہر شخص ہو جب زر بکف
ہے باعثِ عز و شرف — گر چھوڑ دوں اپنا شغف
لوں ہاتھ میں چنگ اور دف — کیا خوب ہے مطرب کا فن!

یہ سب تو اک افسانہ تھا — تخئیل کا کاشانہ تھا

رندانہ تھی طرز ادا — دل میں ہے حرف مدعا
گو سب نے سنائی واہ وا — ہے مگر اب وقت دعا
مقبول ہو نزد خدا — مقصد نہیں شعر و سخن

کہتے ہیں سب گردوں نشیں — کہتے ہیں سب اہل زباں
ہو آج تم الفت قریں — اے میرے نوشہ آفریں!
اے قیس کے طینت گزیں — اک لیلیٰ محمل نشیں
گھر میں تمھارے ہو مکیں — با عفت و با علم و فن!

ایک نکاحِ ثانی پر

جگر سوز آہیں و دل بے قرار
وہ لب پر فغاں آنکھ وہ اشک بار
وہ اندوہ و حرماں نگاہوں سے پیدا
رُخِ زرد سے زعفراں شرم سار
وہ بیدادِ محبوب سے دل کے ٹکڑے
جفا ہائے پیہم سے سینہ فگار

وہ ماہِ دو ہفتہ کی اندھیری دنیا
وہ رشکِ چمن ہے خزاں در کنار
وہ کانٹوں میں شب ہائے ہجراں گذارے
جسے آہ سب کہتے ہیں گل عذار

مگر یہ عقیدہ تمھارا یہ مسلک
جسے آج تم نے کیا آشکار
زنِ نو کن اے یار ہر نو بہار
کہ تقویمِ پارینہ نیاید بکار

جرأتِ رندانہ

رنگین شگوفہ ہے کہ چمن زار ہے
اسبابِ ذوق و شوق فزوں از شمار ہے
ہر دم ہوائے عشق سے دل بیقرار ہے
ساقی بازمانِ عیش و مئے خوش گوار ہے
دردی کشو ہو کہ یہ فصلِ بہار ہے
بانگِ طرب ترانۂ الفت صدائے شار
عاشق کے دل کا جوش ہے یا نغمۂ ہزار
ہے مژدہ پاشِ عشق یہ آہنگ جوئبار
بوئے نسیم و رنگِ گل و رونقِ بہار

سامانِ فضل و رحمتِ پروردگار ہے

غم کا خیال چھوڑ کہ پایانِ غم نہیں ۔ دنیا میں کون ہے جسے رنج و الم نہیں
لا جام ساقیا! کہ تو کچھ جم سے کم نہیں ۔ کیوں آج تیرا کل کا سا دستِ کرم نہیں

رکھ یاد تیرا وقت بھی ناپائیدار ہے

مسجد کی مجھ کو کچھ بھی موافق نہیں ہوا ۔ کوچہ سے تیرے میں تو نہ جاؤں گا ساقیا
فردوس بھی ملے تو نہ چھوڑوں گا میکدہ ۔ وہ وقت زہد و موسم رجب و ریا گیا

ہنگامِ عیش و عشرت و کشت گداز ہے

ایک درخواست

میں ہوں اور امتحانِ جذبِ دل ۔ تم ہو اور کاوشِ گمانِ آرزو
رشتۂ مہر چھوڑ دو مہر کو لو ۔ دونوں ہوں سینہ ریشِ قلب گداز؟
کیوں تمنائیں دل میں گھٹ کے رہیں؟ ۔ کیوں دلوں کا نہ ہو دریچہ باز؟
کیوں بسائیں نہ ملکِ یک رنگی؟ ۔ چھوڑ دیں کیوں نہ شہرِ ناز و نیاز؟

کس لیے لوں میں راہِ ترکستان
ہو اگر تم کو شوقِ سیرِ حجاز؟

دعا

(ایک نا کتخدا عزیزہ کے لیئے جو اس کے آٹو گراف البم میں لکھی گئی)

ہمیشہ بن کے نگہ چشم مادرمن میں رہو
عزیز ہو کے صدا مصر علم وفن میں رہو

جبین پہ بل ہو کبھی گر، تو زلف کا بل ہو
جبیں کسی سے تو بو ہو کے یاسمن میں رہو

شگفتہ خاطر و دل شاد انجمن میں رہو
"بہار ہو کے رہو، جا کے جس چمن میں رہو"

رخصت شباب

وہ جنون انگیزیاں رخصت ہوئیں
عقل سے وہ تنر مساری اب کہاں

ہائے وہ پینا پلانا رات دن
اب کہاں وہ جبر جاری اب کہاں

اب کہاں وہ زہد اور تقوی سے بیر
شوق رسوائی وخواری اب کہاں

بزم حسن و عشق ہے اب بھی جمی
باریابی پر ہماری اب کہاں

چل رہے ہیں اب بھی گو نظروں کے تیر ——
آرزو کے زخم کاری اب کہاں

لہلہاے لالہ زارِ داغِ دل عشق کی وہ کشت کاری اب کہاں
رہ نمائی رہ بری کا شوق ہے رہ روی کی خواستگاری اب کہاں
ہم رکابِ اتقا آئی ریا
صدق کی وہ استواری اب کہاں

قیدِ خود اختیاری

(۱)

ہوں مبارک دوستو! دُنیا کی تم کو وسعتیں میری قسمت میں فقط اک تنگ زندان رہ گیا
ہم کو کیا اہلِ خرد ہوں محوِ گلگشتِ چمن چل دیئے اہلِ جنون خالی بیابان رہ گیا

(۲)

راحت کی تمناے کم انجام بہت ہے یعنی کہ مجھے بھی ہوسِ خام بہت ہے
لیکن کبھی کوشش سے نہ حاصل ہوئی جو شئے وہ تیرے لئے اب دلِ ناکام بہت ہے
''نے تیر کمان میں ہے نہ صیاد کمین میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے''

پورٹ بلیر ۔ جزائر انڈمان

عزمِ حجاز

وحشت کو میری دیکھنا اے ہم دمو ذرا — صحرا کو چل دیا درِ جانانہ چھوڑ کر
افسون تخیلات کا مجھ پر رہا مدام — دیکھا نہ اصل کو کبھی افسانہ چھوڑ کر
تھا میں اسیرِ حلقۂ زلفِ بتانِ ہند — لیلیٰ سے منھ کو موڑ کے ریحانہ چھوڑ کر
لیکن ہوا ہوں جب سے کہ میں عازمِ حجاز — احباب کا وہ لطفِ کریمانہ چھوڑ کر
سب عز و جاہ و راحتِ کاشانہ چھوڑ کر — سب حرصِ زر یہ ہمتِ مردانہ چھوڑ کر
تو سن رہا ہوں چاروں طرف سے یہی صدا — "دیکھو تو گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر

مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ"

جہاز رحمانی۔ بمبئی
۳۔ مارچ ۱۹۳۴ء

نذرِ خواجگان

(خواجہ منظور حسین اور خواجہ غلام السیدین کے اساتذہ جامعہ علیگڈھ مقرر ہونے پر)

دو عزیزوں کو مرے آخر ملا ہے ان کا حق
کل تھے جن رتبوں پہ وہ آج ان سے بہتر ہو گئے

ایک منظور حسین اور اک غلام السیدین
اس لیئے دُنیا میں وہ محبوب دو دل بر ہو گئے

مرحبا ذوقِ طلب صد مرحبا ذوقِ عمل!
دونوں بحرِ علم کے کیسے شناور ہو گئے

طالبانِ علم! دیکھو طالبانِ علم کو
علم کی خدمت سے جو سر دار سرور ہو گئے

دیکھا نظارہ ہم نے تمھارا

(ٹرین میں ایک ہم سفر عائلہ (فیملی) کی مسرت کو دیکھکر)

دیکھا نظارہ ہم نے تمھارا
دل کی محبت آہ یہی ہے
عشق کی جنت آہ یہی ہے

اصلی ثروت آہ یہی ہے حق کی رحمت آہ یہی ہے
دیکھا نظارہ ہم نے تمھارا

دیکھا نظارہ ہم نے تمھارا
پریم کے پھل دو نین تمھارے چنچل، میٹھے مدبھرے سارے
بھولے بھالے شکل میں پیارے جن و ملک سب جن پر وارے
دیکھا نظارہ ہم نے تمھارا

دیکھا نظارہ ہم نے تمھارا
لہریں ہے کیا مہر کا دریا جوش میں آیا، اچھلا اڈا
عشق و محبت ان کا حصہ گر نہیں دولت کچھ نہیں پروا
دیکھا نظارہ ہم نے تمھارا

دیکھا نظارہ ہم نے تمھارا
رشک کروں! اوران کو دیکھوں ہائے یہ جنت کیسے پاؤں
ساتھ ہے جنت لیکن میں ہوں یا دل محزوں اس سے بیروں
دیکھا نظارہ ہم نے تمھارا

ترانۂ شوق

خوئے کافر، اور دینِ اسلام ہو، پروا نہیں
مئے گساری اس کا شغلِ عام ہو، پروا نہیں

سنگ دل ہو، اگرچہ گل اندام ہو، پروا نہیں
وہ پری رو، جس طرح ہو، رام ہو، پروا نہیں

گر سویرے کو نہ ہو، تو شام ہو، پروا نہیں

کیوں بساؤں جا کے میں وحشت میں اجڑا داغ
کلبۂ تاریک جب روشن کرے وہ شب چراغ

سیرِ سنبل کے لئے کیوں ہو ہوائے سیرِ باغ
مُو پریشاں، سینہ عریاں، آئے جب وہ بد دماغ

گر نہیں صحنِ چمن حمام ہو، پروا نہیں

غنچۂ نازک نہیں ہے لعلِ نوشیں کی طرح
نغمۂ بلبل ہے کب گفتارِ شیریں کی طرح

سنبل و ریحاں کہاں اس زلفِ پُرچیں کی طرح
اے بتِ عطار! تیرے خالِ مشکیں کی طرح

عنبرِ سارا تو ہو، کچھ خام ہو، پروا نہیں

تیرا سینہ صاف اور شفاف ہے آئینہ دار
ہائے ہائے کس کے لئے اس جسمِ عریاں کی بہار

کیوں یہ ہے باقی مرے اور تیرے پیراہن کا تار
بھر کے پیالے پی تو لے دو چار اے مستِ خمار

تیرا ملنا تشنۂ ابرام ہو، پروا نہیں

یہ نہیں کافی کہ ہو وہ لعلِ شکر بار نرم
مثلِ طوطی شیوۂ دل کش ہو اور گفتار نرم

ہو طبیعت نرم، چاہے ہو نہ ہو رخسار نرم
خونِ دلبر گرم ہو، اطوار اور رفتار نرم

مبتلائے جام و مئے آشام ہو، پروا نہیں

خواب تیرے عاشقِ شیدا کو اب نایاب ہے — شوق میں آغوش وا ہے اکس قدر بے تاب ہے
رائیگاں جانے نہ دے یہ رات کیا مہتاب ہے — عید گزری آج ہی آ، تو تو عالم تاب ہے

صبح گر آنا نہ ہو، تو شام ہو پروا نہیں!

(از ندیم استنبولی)

بُلبُل

(از ترکی)

یہاں گل میں جو تیرا مکان ہے، اے بلبل! — تو پھر یہ کس لئے شور و فغان ہے اے بلبل!
خروش جو ہے بہاری ہے، یا ہے خندۂ گل — تو کس کے واسطے نالہ کنان ہے، اے بلبل!
تو تازہ برگ ہے اور غنچہ جلد بکھرے گا — تیرے نصیب میں عیش جہان ہے، اے بلبل!
خطیب منبرِ عرفان ہے تو حقیقت میں — تری نوائے سحر اک اذان ہے، اے بلبل!
روا ہے گر کہیں تیری نوا کو سحرِ حلال — جو دل میں گھر کرے تیرا بیان ہے، اے بلبل!
عجب نہیں جو یہ پوچھیں کہ تجھ سے غنچہ دہن — بتا کہ کیا تیرا درد نہان ہے، اے بلبل!

کسی کو عشق کی تیرے خبر نہیں افسوس
مرا قلم ہی ترا ترجمان ہے، اے بلبل!

لکھنؤ ٹریننگ کالج کے مشاعرے کی صدارتی نظم

کیوں مجھ کو کیا ہے صدر مجلس — کیوں مجھ کو عطا ہوئی یہ جاگیر

جب دیکھئے تخت پر ہوں بیٹھا — منبر پہ ہو جیسے واعظ پیر

مانا کہ ہے میرا نالہ دلکش — ہے دل میں تڑپ زباں میں تاثیر

رنگینی بھی ہے سخن میں ایسی — ہوتا ہے جوان عالم پیر

ہے توسن طبع شوخ و طرار — چال اس کی کڑی کمان کا تیر

لیکن نہیں شاعری کا دعویٰ — ہاں نثر میں کچھ کیا ہے تحریر

[illegible] مختصر ہے ورنہ — کیا ہیچ مداں کی ہیچ تحریر

ہوں شاہد شعر کا میں شیدا — بس اس لئے ہے میری یہ توقیر

صد شکر ز سعی نوجوانان — یک قصر ادب شدست تعمیر

اس بزم میں ایک ادیب کہنہ — کیوں لائے ہیں آپ بہر تشہیر

تھا گوشہ نشیں زاویہ میں مخفی — کیوں کھینچ کے لائے پا بہ زنجیر

معذور کرم ہوں لیکن اب یا [illegible] — ہے [illegible] پہ تقدیر

رسم است کہ شاہ [illegible] تحریر

آزاد کنند بندۂ پیر را

نوجوان سے!

میدانِ جد وجہد مین اے نوجوان اُٹھ — کب تک پڑے رہو گے یونہی کوئے یار مین

کب تک قتیلِ دلبریٔ شاہدِ سخن — مانا کشش بلا کی ہے اس سحر کار مین

مین جانتا ہون تشنۂ ذوقِ سخن ہے کیا — مدہوش رہ چکا ہون مین اس کے خمار مین

دنیائے حسن و عشق ہی پیشِ نظر رہے — داخل ہوا نہ زیست کے میدان کارزار مین

آہ و فغان و نالہ تھا سرمایۂ حیات — حسرت ہی جان گزین تھی دلِ داغ دار مین

مین انقلابِ چرخ کا قائل رہا مگر — منکر کہ انقلاب بھی ہے گَردِ روزگار مین

جاگا تو دیکھا زیست ہے اہلِ عمل کی زیست — شاعر ہے کوئے یار مین وہ کارزار مین

عقدۂ لاینحل

کوئی اب شاملِ اربابِ وفا ہوتا ہے — آج وہ مائلِ اندازِ جفا ہوتا ہے

کوئی اب داخلِ زندانِ بلا ہوتا ہے — کوئی اب عیش و تنعم سے جدا ہوتا ہے

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق — ہوسِ جاہ پہ اب کون فدا ہوتا ہے

میری گستاخی پہ کیون کوئی خفا ہوتا ہے — شوقِ پابوسی مین کیا اس کے سوا ہوتا ہے

چارہ سازِ غم و ہم راز سے کہنا کہ اُٹھو! — مجھ سے پوچھے کوئی کیا اس مین مزا ہوتا ہے

چھوڑ کر کعبہ کو اب جائین کہان لات و منات — ان پہ کیون ظلم یہ اے میرے خدا ہوتا ہے

آسمان پر شفقِ سرخ زمین پر لالہ — رائگان یونہی تو خونِ شہدا ہوتا ہے

سن کے فرمایا کہ یہ ہے اسی آشفتہ کا رنگ — میرے اشعار کا انداز جدا ہوتا ہے

قیس عامر سا! وہ مجنون بھی ہے لاغر بھی ہے — نام سجاد ہے اور تمہ رہ فدا ہوتا ہے

کعبے کے سامنے

آوارہ گرد آج ترے در پہ ہے کھڑا — اللہ کیا کشش ہے ترے آستانے مین
تشکیک و شبہ دشمن ایمان ہی رہے — سنتا ہون دل کا چین ہے تیرے خزانے مین
صحرا بھی ہے گیاہ ہے اور کوہ ہائے خشک — کیا رمز تھا یہان چمن دین کھلانے مین
دل کو نہ جب خشوع و خضوع ہی ہو نصیب — کیا فائدہ ملا مجھے سر کے جھکانے مین
احرام و طوف سارے ظواہر تو مل گئے — اے کاش اور کچھ بھی ملے اس ٹھکانے مین
مسلم کو جس طرح سے ستاتے ہین اہل دیر — ہے پاسبان حرم کا بھی ماہر ستانے مین
رنگین حجاز ترک عرب کے لہو سے تھا — کوشان ہے نجد اور اسے رنگین بنانے مین
یہ سچ تو ہے مگر مرے اللہ یہ نہ ہو — اغیار دخل پائین ترے آستانے مین
واقف ہے تو کہ درد بھرا ہے ہمارا حال — کیا تیرے آگے درد بھرون اس ترانے مین
طپا [illegible] یہ ہے جہانہ — تو اپنے گھر کو خود ہی بچا اس زمانے مین

شہیدان سیاست

کوئی میری تعریف کرتا نہین — کرون مین تو خود آپ اپنی کرون
مرے دل مین ہے شوق جنگ و ستیز — نہین مجھ کو پروائے صلح و سکون
مین خواہان ہون آزادی ملک کا — نہ اس کے عوض دین و دنیا مین لون

نہین منطق و فلسفے سے غرض — نہین جانتا ہین بہت چند وچون
زِ نقارہ آواز آمد برون — کہ دون ست دودون ست دون ست دون

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی

لڑکے کو فکر صبح و مسا امتحان کی ہے — بیوی کو سوچ یہ میری لڑکی کہان کی ہے
پڑھنے سے کچھ غرض نہ پڑھانے سے واسطہ — اُستاد جامعہ کو ہوس عز و شان کی ہے
بھائی کو ٹھونس دون کہ بھتیجے کو ٹھونس دون — اب اپنے بعد فکر انھین خاندان کی ہے
ہو جامعہ مین روز نیا معرکہ تو کیا — ہم کو تو فصلِ گُل و گلستان کی ہے
اے کاش لالہ زار ہو پھر صحنِ بوستان — حسرت یہی اس ایک دلِ خونچکان کی ہے
"شاید مرا فسانہ انھین لطف دے گیا — سُنتا ہون اب تو روز طلب قصہ خوان کی ہے"

نواب صاحب چھتاری کے نام

(دولتِ آصفیہ کی وزارت سے سرفراز ہونے پر)

وہ فاتحِ قلوب دلون کا وہ حکمران — پرچمِ ظفر کا کھول کے ہوتا ہے پھر روان
ہندوستان کے بعد ہے فتحِ دکن کا عزم — نصرت تمھین نصیب سر احمد سعید خان
اللہ نے کیا ہے تمھین صاحبِ نفوذ — اور شاہ نے کیا ہے رعایا کا پاسبان

کوشش یہ ہو کہ خلقِ خدا کا رہے خیال — اور یہ نہ ہو تمھاری جبیں شہ کا آستان
سوچی گئی ہیں تم کو دکن کی مقدرات — اب اس کو خار زار بناؤ کہ گلستان
ہو معدلت اساس سیاست مدار کا — نصفت مآب بن کے کرو سحر کاریاں
لازم ہے قلع قمع کرد اہلِ جور کا — اوروں کے واسطے ہو خطا بخش و مہرباں
دل دار و دل نواز و کرم گستر و جواد — زر پاس و سیم پاش و گہر بار گل فشاں
ہو غلغلہ دکن میں کہ یاں آ گیا وزیر — حق کوش، حق شناس، بہی خواہ، قدر داں

ایک غم زدہ دوست کے نام

نہ مرنے کی کرنا کبھی آرزو — شکستہ نہ کر اپنا جامِ سبو
بچاتا ہے جان کو ہر اک جاندار — وہ بدبخت ہو یا ہو کامگار
وہ بلبل کہ جو ہے اسیرِ قفس — اسے بھی ہے جینے کی از بس ہوس
اِدھر دیکھو ہر ایک شیرِ ژیاں — وہ سلطانِ صحرائے وحشت نشاں
اُدھر ہے اک آہوئے چالاک و تیز — وہ آنکھیں رسیلی ہوائیں وہ خیز
جھپٹتا ہے آہو پہ شیرِ ژیاں — وہ آہو چلا جیسے تیر از کماں
یہ کیا ہے؟ یہ ہے آرزو زیست کی — اسی سے ہے آہ درد زیست کی
وہ شہباز جنگ آور تیز پر — اُدھر آسمان کے ہے جس کا گذر
کبوتر کو پنجے میں اس نے لیا — کبوتر جیا بھی تو کے دن جیا

مگر کس قدر پھڑ پھڑاتا ہے زہ
اور اپنے کو آخر چھڑاتا ہے وہ

ہے آغشتہ خون سے تنِ نازنین
مگر خواہشِ زیست دل مین مکین

اگرچہ امیدِ رہائی نہین
قفس مین بھی ہے نغمۂ دل نشین

غرض زاہدی یہ نصیحت شنو
جیو گرچہ جینے مین غم ہی سہو

مگر کر رہا ہے جو یہ وعظ و پند
نہین خود نصیحت پہ وہ کار بند

وہ دُنیا سے نومید و بیزار ہے
غم و رنج کا اس پہ انبار ہے

وہ قلبِ حزین و دلِ دردمند
وہ سوزِ درون و فغانِ بلند

شب و روز صبح و مسا تلخ کام
چہ خوش دادہ ام زندگی را نظام

ایک بُت پرست مسجود

(نظم بہ تقریب شادی خانہ آبادی جناب خواجہ غلام السیدین)

آج تو مائلِ مقصود ہوا خوب ہوا
اپنے ہم چشموں کا محسود ہوا خوب ہوا

ثروت و علم کا ہے آج قرانِ السعدین
علم ثروت پہ جو افزود ہوا خوب ہوا

مائلِ عشق ہے جو آج پہ و نیسر ہے
علم کا عشق جو مقصود ہوا خوب ہوا

آج تک کوئی بھی کیوپڈ سے بھلا جیتا ہے
اس سے لڑنا ترا بے سود ہوا خوب ہوا

زاہدِ خشک ہوا معتکفِ بیتِ صنم
بُت پرست آج یہ مسجود ہوا خوب ہوا

سچ تو یہ ہے کہ یہی کیون نہ کہے اب سجاد
قصرِ ساجد ترا مسجود ہوا خوب ہوا

رجزِ مجاہد

(تیاتر "طارق" کا منظوم حصہ)

مروان : (پڑھتا ہے)

ابر میں جیسے چمکتی ہوئی برق
نور میں تھا مرا شہزادہ غرق
گھیرے اعدا تھے کہ تھا غرب میں شرق
مجھ سے امداد کا طالب وہ ہوا

عزیز : (پڑھتا ہے)

وہ ملک چہرہ بہ سیرت خرغام
اس کی خدمت میں مرا پہنچے سلام
جس نے جاں بخش دیا مجھ کو پیام
"میں نے دشمن کا ابھی سر کچلا"

مروان :

کیوں نہ تا حشر مرے دل میں بسے

شکریہ مین لیئے بوسے اس نے
اپنے لب سے مری پیشانی کے
غرقِ احسان و کرم مجھ کو کیا

عزیز:

عالمِ خواب مین وہ مہر لقا
جان و دل اس پہ فدا اس پہ فدا
مجھ کو دکھلاتی ہے پیارا چہرا
دل نے پھر اس کو طلب کر ہی لیا

مردان:

کبھی شکر اور کبھی شکوہ کرے
مین کہون مین نے کیا کیا وہ کہے
دیدم از تو کہ ندیدم ز کسے
کر کے زندہ مجھے پھر قتل کیا
جب مین خیمہ مین پڑی ہوتی ہون
کاش وہ کان مین پھونکے یہ فسون
آ گیا دیکھ یہ تیرا مجنون
غمِ ہجران کو بہت مین نے سہا
لے کے اک بوسۂ آتش ترکیب
بجلیان دل مین دوڑائے جیب

عزیز:

کیوں نہ ہو (جبکہ میں ہوں اسکے قریب)
سینِ جسم مرا آتش زا
کاش پھر خطرے میں میں پڑ جاؤں
اور وہ آواز خوش آئند سنوں
"نہ کرو خوف کہ میں آتی ہوں
کون ہے جس نے کہ پھر حملہ کیا"
یعنی پھر اس کا میں دیدار کروں
جان کو صدقے میں ہر بار کروں
چارۂ دردِ دلِ زار کروں
یوں کہوں پھر خدا اب نہ ستا

مروان:

کون سنتا ہے دلِ زار کا حال
زندگی میری ہوئی مجھ پہ وبال
جب سے دیکھا وہ فرشتہ تمثال
دل تڑپتا ہے مرا صبح و مسا
اس کو جی بھر کے نہ میں دیکھ سکی
ہائے کس کام کی تھی عمر مری
لمحۂ عیش کی قیمت یہ ملی
عمر بھر کے لئے اک روگ لگا

عزیز:

ہوگئی دل مین مرے آکے مقیم
کوئی اس کا نہ شریک اور سہیم
کرم خاص ہے تیرا یہ کریم
ایسے ویرانے کو آباد کیا

سروان:

کیون نہ ہو دل مین مرے آکے مکین
ہم نشین اس سا کہن کوئی نہین
نہ فلک پر ہے نہ بالائے زمین
میرا محبوب وہ بے ہمتا

عزیز:

ہو مسیحا یہ ہے سب کو معلوم
دل پہ یہ نقش مگر ہے مرسوم
یہ بھی کرسکتی ہو کار مذموم
کہ تغافل سے کرو مجھ کو فنا

اپنا دیدار دکھاؤ پیارے
خواب مین رات کو آؤ پیارے
سارے عالم فدا تم پہ کیا
ٹھوکرون سے وہ جلاتا آئے
قم بہ اذنی وہ سُناتا آئے

اپنے طارق کو بلاتا آئے
پھر نہ جائے کہ قیامت ہو بپا

غزل

بنے ہیں ہونٹ مرے نالہ و فغاں کے لئے
ہے سینہ وقف مرا سوزشِ نہاں کے لئے

کوئی زمانہ کا شاکی، کوئی فلک کا ہے
ہمارے سارے گلے اپنے مہرباں کے لئے

ہلاک کرکے رہے گا مجھے تغافلِ دوست
ہے اک نگاہ کا اغماض نیم جاں کے لئے

ہو ڈھونڈ ڈھونڈ کے سب مجھ پہ مشقِ اے احباب
رہے نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

ہوئے جو طعنۂ اعدا کبھی ذرا کو بند
زباں سے کام اعزا نے خود ستاں کے لئے

کڑک چمک نہ تو اے برق اس سے کیا حاصل
شرارہ ایک بہت کافی اس آشیان کے لئے

مرا جو حصہ ہے وہ مجھ کو اے مصیبت دے
ہوا کرے ہے اگر عیش کُل جہان کے لئے

چمن میں بلبلِ مہجور کی نہیں کچھ یاد
تڑپ رہی ہے قفس میں وہ بوستان کے لئے

بھلا دے یادِ وطن جب میں جاؤں اے غربت
وطن کا عشق ہے اک روگ میری جان کے لئے

ثروت آرا (مرحومہ)

(یعنی ہمشیرہ نذر سجاد صاحبہ کی یاد میں)

دل سے جاتا ہی نہیں آہ خیالِ ثروت
کیا ہوا نئی میں ہوا خشک نہالِ ثروت

اس نے راحت کبھی دنیا میں نہ دیکھی آکر
اشک افشان رہا ہر شخص بہ حالِ ثروت

عمر بھر وہ رہی تسلیم و رضا کی تصویر
فاطمہؓ سے تھا ضیا گیر جمالِ ثروت
اس کی شیریں سخنی اور تواضع اس کی
دل نشین، دلبر و دل کش تھی خصالِ ثروت
دل میں ارمانوں کے تھے دفن خزانے کیا کیا
ساتھ ثروت کے گیا مال و منالِ ثروت
حور عین بن کے الٰہی وہ رہے جنّت میں
اور باقی رہے دُنیا میں مثالِ ثروت

ہمدمِ دیرینہ

اے دوست دیا ساتھ نہ احباب کا تم نے
یہ شرطِ رفاقت تھی ہیں چھوڑ گئے تم!
مضبوط پکڑتے تھے سرِ رشتۂ الفت
یہ کیا کہ جھٹک کر اُسے خود توڑ گئے تم

اے عالمِ فانی سے نظر پھیرنے والے
ہے کوئی کشش تجھ کو یہاں پھیر جو لائے

وہ ڈوب گیا جس نے ہزارون کو ابھارا
کس کس کو دیا ہمت عالی سے سہارا
یعقوب سا اب کوئی نہ آئے گا دوبارا
شیرین سخن و دوست نواز، انجمن آرا
وہ جو کہ لٹا دیتا تھا احباب پہ دولت
وہ پیکر اخلاص و تمثال محبت!

احباب پرستی کا نمونہ تھے تو تم تھے
احباب فراموش کو شرماؤ تو آکر
یعقوب بھی احباب فراموش ہی نکلا
اس طعنۂ دلدوز کو جھٹلاؤ تو آکر
آرام سے کیون زیر لحد جا کے ہو لیٹے
اپنے کو بچاتے ہوئے دامن کو سمیٹے!

بیکار ہے بیکار ہے اخلاص و محبت
اب کوئی نہ ہو گام زن جادۂ الفت
وہ مدعئ رہبری راہ محبت
کہتا تھا زمانہ کہ وفا اس کی ہے خصلت
یون چھوڑ چلا جیسے شناسا ہی نہ تھا وہ
اس طرح گیا جیسے کہ آیا ہی نہ تھا وہ

فردیات

تمھین خبر بھی ہے کچھ کیسا بد نصیب ہون مین
سفر مین تم ہو مگر اصل مین غریب ہون مین

سیدین و مسٹر و رقدوائی کا ذکر و خیال
درد بھی یہ ہوگیا اور یہ ہی درمان ہوگیا

واہ کس کے واسطے تو ہوگیا عشرت کدہ
انڈمن کیون ہند کے واسطے منحوس زندان ہوگیا
